سرزمینِ بہار کی دو عظیم شخصیتیں

یٰسں اختر مصباحی
دارالقلم، دہلی

انیسویں صدی عیسوی کے نصفِ ثانی کی پہلی دَہائی میں متحدہ ہندوستان کے جوممتاز عُلماے کرام اُس وقت کی انگریزی حکومت کے لئے چیلنج اور دردِسر، ثابت ہوئے

اُن میں جنوبی ہند کے مولانا سید احمد اللہ شاہ، مدراسی، قادری، چشتی (شہادت ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء) اور مولانا ڈاکٹر، وزیر علی خاں، ابوالعلائی، منعمی، بہاری، اکبرآبادی (وصال ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۳ء) کے نام، نمایاں ہیں۔

مولانا سید احمد اللہ شاہ، مدراسی، طبقۂ عُلماے ہند میں واحد، ایسی شخصیت ہیں جنھوں نے طویل منصوبہ بندی اور خُفیہ سرگرمی کے ساتھ، اکبرآباد (آگرہ) پہنچ کر ۱۸۴۶ء سے اپنی کامیاب، انگریز مخالف مُہم کا آغاز کیا۔

اکبرآباد (آگرہ) اُس دَور میں اَربابِ حکومت و اِقتدار اور اَصحابِ علم و فضل کا مرکز بنا ہوا تھا۔

مولانا مدراسی نے آغازِ اَمر میں مفتی صدرالدین، آزردہ دہلوی (وصال ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) سے مشورہ کیا اور دہلی کو اپنی سرگرمی کا مرکز بنانا چاہا تو انھوں نے نہایت دوراندیشی پرمبنی، یہ صحیح رائے دی کہ:

اِس کام کے لئے سب سے مناسب جگہ، اکبرآباد (آگرہ) ہے۔

اِس مشورہ کے ساتھ، مفتی آزردہ دہلوی نے مفتی انعام اللہ، گوپاموی، سَرکاری وکیل آگرہ (متوفی ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۹ء) کے نام، ایک مکتوب لکھ کر مولانا مدراسی کے حوالے کیا۔ یہ واقعہ ۱۸۴۶ء کا ہے۔

اِس سفارشی مکتوب نے مولانا مدراسی کے لئے عُلما و فُضَلاے اکبرآباد سے روابط و تعلقات اور اپنے مخصوص مقصد میں کامیابی کی راہیں کھول دیں۔

آگے چل کر مولانا مدراسی نے لکھنؤ پہنچ کر ۱۸۵۵ء میں قائدِ جنگِ آزادی، علّامہ فضلِ حق، خیرآبادی (متوفی، صفر ۱۲۷۸ھ/۲۰/ راگست ۱۸۶۱ء۔ جزیرۂ انڈمان و نکوبار) سے ملاقات اور اپنی مُہم کے بارے میں راز و نیاز کی باتیں کیں اور پُرعزم ہو کر اپنی مُہم کو آگے بڑھایا۔

اِسی سلسلے میں وہ، کان پور پہنچ کر، جنرل عظیم اللہ خان سے بھی ملے۔

مولانا سید احمد اللہ شاہ، مدراسی کو انگریز، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا دل، دماغ اور دست و باز و سمجھتے تھے۔

ایک انگریز مؤرخ، ٹامس سٹین لکھتا ہے کہ:

(ترجمہ)..وہ (احمد اللہ، مدراسی) بڑی قابلیت رکھتا تھا۔ وہ، ایسا شجاع تھا کہ خوف نہیں کھاتا تھا۔
اپنے عزم کا پکّا اور مستقل مزاج تھا۔ باغیوں میں اس سے بہتر کوئی سپاہی، نہ تھا۔
کہا جاتا ہے کہ اس نے ہی چپاتیاں، تقسیم کرائی تھیں۔"

(ص ۹۲۔ جلد ۳۔ تاریخ عروجِ عہدِ انگلشیۂ ہند۔ از مولوی ذکاء اللہ، دہلوی، متوفی۔ ۱۹۱۰ء۔
مطبوعہ دہلی ۱۹۰۳ء)

۱۸۵۷ کا مشہور محقق و مورخ، میلسن لکھتا ہے:

....وہ بڑا، عجیب انسان تھا۔ فوجی لیڈر کی حیثیت سے اس کی صلاحیت کے
بہت سے ثبوت ملے ہیں۔..................

کوئی شخص، یہ ناز نہیں کر سکتا کہ اس نے
دو مرتبہ، (انگریز کمانڈر) سر کالن کیمبل کو سرِ میدان، شکست دی۔
یہ کارنامہ مولوی، مدراسی نے انجام دیا۔ (ص ۳۸۱۔ جلد ۴۔ میلسن)

مولانا سید احمد اللہ شاہ، مدراسی نے اکبر آباد (آگرہ) میں جو مجلسِ عُلما قائم کی تھی
اُس کے، مولانا ڈاکٹر وزیر خان، بہاری، اکبر آبادی، رکنِ رکین اور اہم ممبر تھے۔
مولانا مدراسی کے ہزاروں مریدین تھے۔ وہ، اکثر محفلِ سماع، منعقد کیا کرتے تھے۔
مولانا ڈاکٹر وزیر خان، بہاری، اکبر آبادی (متوفی ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۳ء۔ مدفون جنت المعلیٰ
مکہ مکرّمہ) کے والد، محمد نذیر خاں نے مولانا وزیر خاں کو ابتدائی تعلیم، بہار میں دلائی۔
اس کے بعد، مُرشد آباد (بنگال) بھیج کر انگریزی تعلیم دلائی اور پھر، انہیں، انگلینڈ بھیج دیا۔
انگلینڈ میں مولانا وزیر خاں نے ڈاکٹری کی تعلیم، حاصل کی۔ ساتھ ہی اپنے ذوق کے مطابق
بڑی محنت سے یونانی اور عبرانی زبانیں سیکھیں اور انجیل و توریت وغیرہ کا مع شروح و حواشی، عمیق مطالعہ کیا۔
ہندوستان واپسی کے بعد، پہلے، کلکتہ کے بڑے اسپتال میں حکومت کی جانب سے اسسٹنٹ سرجن
مقرّر رہوئے۔ پھر، اکبر آباد (آگرہ) آئے۔

یہاں، مفتی انعام اللہ، گوپاموی، وکیل صدر، آگرہ سے ربط و ضبط ہوا۔ پھر، مولانا سید احمد اللہ شاہ
مدراسی سے رابطہ، اُستوار ہوا۔ جس کے نتیجے میں جہاد و حُرّیت کا جوش و جذبہ، آپ کے اندر پیدا ہوا۔

انقلابِ ۱۸۵۷ء کے ممتاز عُلما و قائدین کی فہرست کے نمایاں اَسمائے گرامی، اِس طرح ہیں:
مفتی صدر الدین، آزردہ دہلوی (متوفی ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) علاّمہ فضلِ حق، خیر آبادی (متوفی ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) مولانا سید کفایت علی، کافی مرادآبادی (شہادت ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء) مفتی عنایت احمد کاکوری (متوفی ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۳ء) مولانا سید احمدُ اللہ شاہ، مدراسی (شہادت ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء) مولانا رحمت اللہ، عثمانی، کیرانوی (متوفی، رمضان ۱۳۰۸ھ/مئی ۱۸۹۱ء) مولانا ڈاکٹر، وزیر خاں، بہاری اکبرآبادی (متوفی ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۳ء) مولانا فیض احمد، عثمانی، بدایونی (متوفی، نامعلوم) مولانا وہاجُ الدین مرادآبادی (شہادت ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء) مفتی مظہر کریم، دریابادی (متوفی ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۳ء)

انقلابِ ۱۸۵۷ء میں، علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی نے فکری اور اعلیٰ سطحی قیادت فرمائی۔
بہادر شاہ ظفر، سے بار بار ملاقات اور جنگ کے بارے میں تبادلۂ خیال و تحریک کا لال قلعہ دہلی کے متعدد برطانوی جاسوسوں نے اپنے اپنے روزنامچے میں، ذکر کیا ہے۔
۱۸۵۷ء کے، کوتوالِ دہلی، سید مبارک شاہ کے بیان کے مطابق "کِنگ کونسل" کے یہ تین نہایت اہم ممبران تھے: مولانا فضلِ حق خیر آبادی، مولوی سرفراز علی اور جنرل بخت خاں۔"
انگریز نواز مؤرخ، مولوی ذکاءاللہ، دہلوی (متوفی ۱۹۱۰ء) نے لکھا ہے کہ:
"انھوں (مولانا فضلِ حق خیر آبادی) نے بادشاہ (بہادر شاہ ظفر) کے لئے ایک دستورُ العمل سلطنت لکھا تھا۔"
(ص ۶۷۹۔ **تاریخِ عروجِ عہدِ انگلشیہ**۔ مولّفہ مولوی ذکاءاللہ، دہلوی۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۰۳ء)
پروفیسر محمد ایوب قادری (کراچی) لکھتے ہیں کہ:
..........جنرل بخت خاں کے مشورہ سے علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی نے بعد نمازِ جمعہ جامع مسجد، دہلی میں جہاد کی اہمیت وضرورت پر تقریر کی۔ اور جہاد کا اِستفتا، مرتّب کر کے پیش کیا۔"
(ص ۲۲۔ **جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک مجاہد!** مولانا فیض احمد، بدایونی۔ مولّفہ پروفیسر محمد ایوب قادری۔ مطبوعہ کراچی ۱۹۵۷ء)
جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء، وتحریکِ آزادی ۱۹۴۷ء کے ممتاز محقق ومؤرّخ رئیس احمد، جعفری، ندوی لکھتے ہیں:
"وہ (مولانا فضلِ حق، خیر آبادی) بادشاہ (بہادر شاہ ظفر) کے مُعتمد، مُقرّب، مُشیر تھے۔
.......انہوں نے، غدر (۱۸۵۷ء) میں، دلیری اور جُراُت کے ساتھ، علانیہ حصہ لیا۔ انھوں نے

متعدد وَالیانِ ریاست اور اُمَر ائے ہند کو، اِس تحریک (۱۸۵۷ء) میں شامل کرنے کی کوشش کی۔

........حقیقت، یہ ہے کہ اس تحریک (۱۸۵۷ء) کو، مولانا کی شرکت سے بڑی تقویت پہنچی۔''

(ص ۸۶۲۔ **بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد**۔ مولّفہ رئیس احمد، جعفری، ندوی۔ مطبوعہ لاہور۔ ۱۹۵۶ء)

مفتی انتظام اللہ، شہابی، اکبرآبادی لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر وزیر خاں کو انگریزوں سے دشمنی اور حُریت نوازی کا چَسکا، شاہ (احمد اللہ، مدراسی) صاحب کے فیضِ صحبت سے پڑا۔ شاہ صاحب، انگریزی حکومت کے خلاف، میدان، تیار کر رہے تھے۔''

(ص ۸۱۔ **غدر کے چند عُلما**۔ از مفتی انتظام اللہ، شہابی۔ مطبوعہ دہلی)

مولانا وزیر خاں، بہاری، اکبرآبادی کی ایک عظیم دینی خدمت کا درخشاں باب، یہ ہے کہ:

۱۸۵۴ء میں آگرہ کے اندر، پادری فنڈر سے ہونے والے تاریخی مناظرہ میں بنیادی کردار ادا کر کے، دینِ اسلام کی صداقت وحقانیت کو، روزِ روشن کی طرح، واضح کر دیا۔

نصرانیت وعیسائیت کے مطالعہ وتحقیق اور رَدِّ نصاریٰ میں

اُس وقت، مولانا رحمت اللہ، عثمانی، کیرانوی (وصال، رمضان ۱۳۰۸ھ/مئی ۱۸۹۱ء۔ مدفون جنت المعلیٰ مکہ مکرَّمہ) بہت ممتاز عالمِ دین ومناظرِ اسلام وقائدِ انقلاب ۱۸۵۷ء تھے۔

وہ، جب اِسی موضوع کی اپنی مشہور کتاب ''اِزالۃُ الْاَوْھَام'' کی طباعت کے سلسلے میں دہلی آئے ہوئے تھے، تو حُسنِ اتفاق سے مولانا وزیر خاں سے یہیں، ملاقات ہوگئی۔

اور ذوق ومزاج کی ہم آہنگی کی وجہ سے دونوں کے درمیان، خصوصی دوستی ہوگئی۔

مولانا کیرانوی نے اپنے استاذِ علمِ حدیث، مولانا شاہ عبدالرشید، مجدّدی، دہلوی (وصال ذوالحجہ ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۱ء۔ مکہ مکرَّمہ) کے حکم پر ''اِزَالَۃُ الْاَوْھَام'' کی تالیف کی تھی۔

''انگلستان سے، بڑے بڑے عُلمائے عیسویت، ہندوستان، روانہ کیے جاتے۔

قِسّیسِ اَعظم، فنڈر ۱۸۵۳ء میں ہندوستان آیا۔ گورنروں کے یہاں، قیام کرتا تھا۔

دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر اسلام کے خلاف، وعظ کہا کرتا تھا۔

یہ عربی فارسی کا عالم اور فنِ مناظرہ کا واقف کار ہی نہیں، بلکہ بڑا شاطر تھا۔

اُن دِنوں، عُلمائے کرام، عیسوی مذہب سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے تھے۔ انجیل اور توریت کا مطالعہ تو کُجا؟ پادری فنڈر، اسلام پر جو اعتراضات کرتا تھا، اُس میں اُلجھ کر عُلما، رہ جاتے۔

اُس کو معلوم ہوا کہ صدر نظامت کی وجہ سے آگرہ، عُلما کا مرکز بنا ہوا ہے۔

اس زعمِ باطل میں، وہ، آگرہ آیا۔ اعلیٰ حکّام کے یہاں، مقیم ہوا۔
اور مشاہیر عُلما کو کھلا چیلنج دے دیا۔ ''**مجلسِ عُلما**'' میں مشورہ ہوا۔ اور مولانا ڈاکٹر وزیر خاں نے
پادری فنڈر کا چیلنج، منظور کر لیا اور اپنے دوست، مولوی رحمت اللہ، کیرانوی کو بلا بھیجا۔''
(ص ۸۲۔ **غدر کے چند عُلما**۔ از مفتی انتظام اللہ، شہابی، اکبر آبادی۔ مطبوعہ دہلی)
۱۸۵۴ء میں آگرہ کے اندر، پادری فنڈر اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے درمیان
فیصلہ کن مناظرہ ہوا۔ مولانا وزیر خاں، بہاری، اکبر آبادی اور مولانا فیض احمد، بدایونی
اِس مناظرہ میں مولانا کیرانوی کے خصوصی معاون تھے۔
پادری فنڈر کو، اِس مناظرہ میں شکستِ فاش ہوئی۔
جس کے بعد اُسے، صرف آگرہ نہیں، بلکہ ہندوستان سے منہ چھپا کر انگلینڈ میں پناہ لینی پڑی۔
اِس مناظرۂ آگرہ ۱۸۵۴ء کی تفصیلی روداد، اُسی دَور میں شائع ہو چکی ہے۔
مولانا رحمت اللہ، کیرانوی و مولانا وزیر خاں، بہاری، اکبر آبادی اور مولانا فیض احمد، عثمانی، بدایونی
یہ تینوں حضرات، اپنے اپنے طور سے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں بھی، شریک ہوئے۔
انجامِ کار، اِن حضرات کو ہندوستان چھوڑنا پڑا۔ مولانا رحمت اللہ، کیرانوی اور مولانا وزیر خاں
ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ مکرّمہ چلے گئے۔
مولانا فیض احمد، عثمانی، بدایونی، ہندوستان چھوڑ کر نیپال کی طرف نکل گئے۔
کب کہاں، کس طرح آپ کا انتقال ہوا؟ اِس کا ابھی تک، کسی مؤرخ کو علم نہ ہو سکا۔
مولانا امداد صابری، دہلوی لکھتے ہیں کہ:
''۱۸۵۴ء کے اکبر آباد (آگرہ) کے مناظرہ کے دوسرے ہیرو، ڈاکٹر وزیر خاں، اکبر آبادی
تھے۔ اور اس مناظرہ میں شریک ہونے والے مولانا فیض احمد رسوا، بدایونی بھی تھے۔
ان حضرات کے، یہ تعلقات، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مُمِد و مُعاوِن، ثابت ہوئے۔
اور انھوں نے متفق ہو کر، اِس جنگِ آزادی میں بہت نمایاں اور اہم کردار ادا کیا۔
جب، میرٹھ کے مجاہدین نے دہلی میں جنگِ آزادی کا بگل بجایا۔ چوں کہ مولانا رحمت اللہ
کیرانوی کا، دہلی کے علمی طبقے اور لال قلعے کے شہزادوں پر، اثر تھا اور ان سے تعلقات بھی تھے
اُس وقت، بہادر شاہ ظفر اور دوسرے مجاہدین کے ساتھ، مولانا رحمت اللہ صاحب نے بھی
جنگِ آزادی کا نقشہ بنانے میں حصہ لیا اور شمولیت فرمائی۔

اور مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی کے ساتھ، جنگِ آزادی میں شریک ہوئے۔" (ص۔۳۱۸و۳۱۹۔**آثارِ رحمت**۔ازمولانا امداد صابری، دہلوی۔مطبوعہ دہلی)

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا ڈاکٹر وزیر خاں بہاری، اکبرآبادی کی سرگرم شرکت کے بارے میں ایک برطانوی جاسوس، عبداللّطیف، اپنے روزنامچے میں ۲۱رجون ۱۸۵۷ء کو لکھتا ہے کہ:

(فارسی سے ترجمہ) "اکبرآباد کے چالاک ڈاکٹر، وزیر خاں کی طبیعت، شورش وفساد کی طرف مائل ہوئی۔آج، اس نے فسادیوں کے ساتھ، اِشتعال انگیز نعرہ لگایا۔اور ایک آگ لگادی۔"

(ص ۱۳۹۔**۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ**۔مرتّبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔مطبوعہ دہلی)

یہاں، یہ بات، ذہن نشیں رہے کہ مولانا فیض احمد بدایونی، بڑے جلیلُ القدر عالمِ اہلِ سنّت اور حضرت علاّمہ فضلِ رسول، عثمانی، بدایونی (وصال ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) کے خواہرزادہ، یعنی بھانجے تھے۔

مولانا ڈاکٹر وزیر خاں، بہاری، اکبرآبادی اور مولانا فیض احمد، عثمانی، بدایونی کی مختلف مقامات کی حربی وعسکری سرگرمیوں کے بارے میں، مشہور دیوبندی مصنف ومؤرخ

مولانا سید محمد میاں، دیوبندی لکھتے ہیں:

"دہلی میں، ڈاکٹر وزیر خاں، جنرل بخت خاں کے مُشیرِ خاص کی حیثیت سے کام کرنے لگے اور مولانا فیض احمد صاحب، مرزا مغل کے پیش کار، مقرر ہوئے۔مختلف معرکوں میں آپ نے شرکت فرمائی۔

۱۹رستمبر ۱۸۵۷ء کو، جب، جنرل بخت خاں نے دہلی سے کوچ کیا

تو مولانا فیض احمد صاحب اور ڈاکٹر وزیر خاں، جنرل بخت خاں کے ساتھ تھے۔

اُس وقت، لکھنؤ میں معرکۂ کارزار گرم تھا۔مولانا شاہ احمد اللہ، مدراسی صاحب، دادِ شجاعت دے رہے تھے۔مولانا فیض صاحب اور ڈاکٹر وزیر خاں لکھنؤ پہنچے اور تمام اہم معرکوں میں، شاہ مدراسی صاحب کے ساتھ رہے۔سقوطِ لکھنؤ کے بعد، سب، شاہجہاں پور پہنچے۔اور یہاں، چند ماہ تک سخت معرکے ہوتے رہے۔

اِسی اَثنا میں مولانا فیض صاحب، بدایوں پہنچے، ڈاکٹر وزیر خاں، آپ کے ساتھ تھے

اور شہزادہ فیروز شاہ بھی، بدایوں پہنچ چکے تھے۔

بدایوں کے معرکہ میں ان مجاہدین نے حصہ لیا۔ککرالہ (بدایوں) کے معرکہ میں قیادت کا فریضہ انجام دیا۔پھر، جب یہاں بھی ناکامی ہوئی تو قصبہ "محمدی" (شاہجہاں پور) پہنچے۔

جہاں، شاہ احمد اللہ، مدراسی صاحب نے حکومت، قائم کر رکھی تھی۔

یہ دونوں بزرگ (مولانا ڈاکٹر وزیر خاں ومولانا فیض احمد) وزارت میں شامل ہوئے۔"

(ص ۳۶۲۔ جلدِ چہارم ۔**علماے ہند کا شاندار ماضی** ۔از مولانا سید محمد میاں، دیو بندی ۔ مطبوعہ کتابستان ۔قاسم جان اسٹریٹ ۔دہلی ۶)

قصبہ محمدی (شاہجہاں پور) میں، مولانا سید احمد اللہ شاہ مدراسی کی شہادت (ذوالحجہ ۱۲۷۴ھ/ جون ۱۸۵۸ء) پر، انگریزوں نے بے پناہ خوشی منائی اور یہ کہا کہ:

''شمالی ہند میں، برطانیہ کا سب بڑا دشمن، ختم ہو گیا۔''

اور پروفیسر محمد ایوب قادری (کراچی) لکھتے ہیں کہ:

''شاہ احمد اللہ صاحب کی شہادت پر روہیل کھنڈ کی ہی جنگِ آزادی نہیں بلکہ درحقیقت، ہندوستان کی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء ختم ہو گئی۔''

(ص ۳۰۳۔ **جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء**۔ از پروفیسر محمد ایوب، قادری۔ مطبوعہ کراچی)

قائدِ جنگِ آزادی ، علّامہ فضلِ حق خیر آبادی نے بھی اپنے ایامِ اسیری کے دَوران (درجزیرۂ اندمان و نِکوبار) مولانا سید احمد اللہ شاہ، مدراسی کو شاندار خراجِ تحسین، پیش کیا ہے۔

دیکھیے ، اَلثَّوْرَۃُ الْھِنْدِیَّۃ ۔از علّامہ فضلِ حق خیر آبادی۔ اردو ترجمہ بنام ''باغی ہندوستان'' ۔ از مولانا عبدالشاہد، شیروانی، علی گڑھی۔ مطبوعہ المجمع الاسلامی، مبارک پور ضلع اعظم گڑھ یوپی۔ ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء۔

قصبہ محمدی (شاہجہاں پور) کی شکست کے بعد، متعدد علما، نیپال جا کر روپوش ہو گئے۔

مولانا رحمت اللہ، کیرانوی اور مولانا ڈاکٹر وزیر خاں، بہاری، اکبر آبادی نے حجازِ مقدس کا رُخ کیا اور مکہ مکرَّمہ میں، اِقامت پذیر ہو گئے۔

مولانا کیرانوی نے ہی ۱۲۹۰ھ میں مکہ مکرَّمہ کا مدرسہ صولتیہ قائم کیا۔

اور شیخ زینی دحلان، مکی، شافعی (متوفی ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۷ھ) کی خواہش و ہدایت کے مطابق رَدِّ نصاریٰ میں، بنامِ **اِظہارُالحق**، ضخیم عربی کتاب لکھی۔

جس کی جدید طباعت و اشاعت، ابھی جلد ہی قاہرہ، مصر سے ہوئی ہے۔

مفتی انتظام اللہ، شہابی، اکبر آبادی لکھتے ہیں:

''سب ساتھی، جدھر موقع ملا، چلتے ہوئے۔ ڈاکٹر وزیر خاں، حجاز روانہ ہو گئے۔
مکہ مکرَّمہ جا کر مولوی رحمت اللہ، کیرانوی کے پاس، مقیم ہو گئے۔ اور وہاں، اپنا مَطب، کھول لیا۔
ایک عرب سردار، عبداللہ الیمنی سے تعلقات ہو گئے۔ اس کی بیوی، سخت علیل ہوئی۔
جاں بر ہونے کی کوئی توقع، نہ تھی۔ ڈاکٹر وزیر خاں کے علاج سے اس کو، شفا ہوئی۔

عبد اللہ الیمنی نے آپ کی مالی خدمت کرنی چاہی۔مگر، آپ نے منظور نہیں کی۔
عبد اللہ، آپ کا بڑا معتقد ہو گیا۔
جب، حکومتِ برطانیہ کا، ہندوستان پر، کامل تسلُّط ہو گیا
تو اپنے باغیوں کی تلاش میں، سرگرمِ سَعی رہی۔
ہندوستان میں جو ہاتھ لگا، پھانسی، یا۔انڈمان کی سزا دی گئی۔
ڈاکٹر صاحب کی تلاش، جاری تھی، معلوم ہوا کہ وہ، مکہ معظّمہ میں ہیں
تو سلطان عبد العزیز (حکومتِ عثمانیہ، تُرکیہ) سے مراسلات کا سلسلہ، جاری کیا اور لکھا کہ:
''ہمارا باغی، آپ کے قلمرو میں ہے۔اس کو، ہمیں دیا جائے۔''
سلطانِ تُرکی نے شریف، عبد اللہ، امیرِ مکہ کو لکھا۔
انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے اظہارِ واقعہ کیا۔اور کہا کہ:
''آپ کو بچانا، میرے دائرۂ امکان سے باہر ہے۔البتہ، آپ، عبد اللہ الیمنی سے ملیے۔''
چنانچہ، ڈاکٹر وزیر خاں، ان سے ملے۔
عرب سردار نے ان سے کہا:
''ڈاکٹر صاحب! دس ہزار عرب، میرے قبیلہ کے ہیں۔
بچہ بچہ کٹ جائے گا، تب کوئی آپ کو ہاتھ لگا سکتا ہے۔''
اور شریفِ مکہ کو کہلا بھیجا کہ سلطانِ روم (تُرکی) کو لکھ دیں کہ:
''ڈاکٹر صاحب، عبد اللہ الیمنی کی اَمان میں ہیں۔کوئی، آنکھ نہیں ملا سکتا۔
چنانچہ، سلطانِ تُرکی نے صاف انکار کر دیا کہ ڈاکٹر صاحب کو نہیں دیا جا سکتا۔
حکومتِ برطانیہ خاموش ہو گئی۔''
(ص ۸۹۔**غدر کے چند علما**۔از انتظام اللہ شہابی، اکبر آبادی۔مطبوعہ دہلی)
مولانا ڈاکٹر وزیر خاں، بہاری، اکبر آبادی، ابو العلائی، منعمی نے مکہ مکرَّمہ میں، چودہ (۱۴) سال
تک، طبابت کر کے اپنی زندگی، بسر کی، اور وہیں ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۳ء میں آپ کا انتقال ہوا۔
جنت المعلی، مکہ مکرَّمہ میں آپ کی تدفین ہوئی۔
تصنیفی ادارہ، دار المصنفین، اعظم گڑھ (یوپی) کے بانی، شبلی نعمانی (متوفی ۱۹۱۴ء) کے شاگرد
معروف مؤرخ اور صوبہ بہار کی مشہور شخصیت، سید سلیمان ندوی (متوفی ۱۹۵۳ء۔کراچی) نے

بڑی حقیقت پسندی کے ساتھ ،لکھا ہے کہ:

''اور خصوصیت کے ساتھ، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا وجود
تو رَدِّ عیسائیت میں تائید غیبی سے کم نہیں۔
اور کون، باوَر کر سکتا تھا کہ اس وقت، پادری فنڈر کے مقابلے کے لئے

ڈاکٹر وزیر خاں، جیسا آدمی پیدا ہوگا؟ جو عیسائیوں کے تمام اَسرار سے واقف اور ان کی مذہبی تصانیف کا ماہرِ کامل اور یونانی وعبرانی کا ایسا واقف ہوگا، جو عیسائیوں کو خود، اُن کی ہی تصنیفات سے ملزم ٹھہرائے گا؟

اور مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کے ساتھ مل کر
اسلام کی حفاظت کا، نا قابل شکستِ قلعہ، دَم کے دَم میں کھڑا کر دے گا؟''

(ص ۱۵۔ دیباچہ، **حیات شبلی**۔ از سلیمان ندوی۔ دارُالمصنفین، اعظم گڑھ۔ یوپی)

بیسویں صدی عیسوی کا نصفِ اول بھی بڑا ہنگامہ خیز ہے۔
قاری محمد طیب (متوفی ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء) مہتمم دارالعلوم دیوبند کے والد
حافظ محمد احمد (متوفی، جمادیٰ الاولیٰ ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء) مہتمم دارالعلوم دیوبند
فرزندِ مولانا محمد قاسم نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) کے، انگریزوں سے خوش گوار تعلقات اوران کی انگریز نوازی اتنی واضح اور مسلَّم حقیقت ہے کہ جماعتِ دیوبند کے عُلما بھی اِس کا اعتراف کرتے ہیں اور کبھی اس کے دفاع کی ضرورت، محسوس نہیں کرتے۔

کچھ یہی حال، مولانا اشرف علی، تھانوی (متوفی ۱۳۸۲ھ/۱۹۴۳ء) کا بھی ہے۔
جن کے ایک بھائی، مظہر علی تھانوی صاحب، انگریزی حکومت کے محکمۂ جاسوسی کے افسرِ اعلیٰ تھے۔
صوبہ اتر پردیش کے نمایاں جاسوسوں میں، ان کا شمار تھا۔
جو مندرجہ ذیل، انکشافاتی تحریر سے ظاہر ہے:

''یعنی (۱) مسٹر سین (۲) مسٹر تصدُّق حسین، ہاپوڑی (۳) مسٹر مظہر علی۔
یہ تینوں افسر، یوپی میں کام کرتے تھے۔
حضرت شیخ الھند اوران کے مشن آزادی کے متعلق اِن تینوں نے بہت سرگرمی سے کام کیا تھا۔
مسٹر سین، انگریز تھا۔ یوپی، سی آئی ڈی کا افسرِ اعلیٰ تھا۔ مگر، مہذَّب، قانون کا پابند تھا۔
اس میں کسی قدر انسانیت تھی۔ لیکن، تصدُّق حسین اور مَظہر علی، نہایت ظالم وجابر تھے۔
ان میں انسانیت اور تہذیب، نام کو نہیں تھی۔''

(حاشیہ ص ۲۸۸۔ **نقشِ حیات**۔ مؤلّفہ مولانا حسین احمد مدنی۔ مکتبہ دینیہ، دیوبند ۱۹۹۹ء)

مولانا حسین احمد مدنی لکھتے ہیں: مولانا (تھانوی) مرحوم کے بھائی، محکمۂ سی آئی ڈی میں افسرِ اعلیٰ تھے۔ ان کا نام، مظہر علی ہے۔ انھوں نے جو کچھ کیا ہو، مستبعد نہیں۔"

(تفصیل کے لئے دیکھیے ۲۹۷ تا ص ۲۹۹۔ **مکتوباتِ شیخ الاسلام، جلد دوم**)

مولانا تھانوی کے بارے میں مولانا عبید اللہ، سندھی (متوفی اگست ۱۹۴۴ء) کے تأثرات نقل کرتے ہوئے پروفیسر محمد سرور جامعی لکھتے ہیں کہ:

..........تحریکِ آزادیِ ہند کے بارے میں ان کی
جو معاندانہ اور انگریزی حکومت کے حق میں جو مؤیدانہ، مستقل رَوِش رہی
اس سے وہ سخت خفا، رہے۔"

(ص ۳۸۲۔ اِفادات و ملفوظاتِ مولانا سندھی۔ از پروفیسر محمد سرور جامعی۔ سندھ ساگر اکیڈمی۔ لاہور)

مشہور دیوبندی عالم و سربراہِ جمعیۃ العلماء اسلام، صوبہ سندھ، مولانا محمد شاہ امروٹی، سندھی فرزندِ مولانا تاج محمد، امروٹی، سندھی نے ستمبر ۱۹۸۷ء کو ایک نہایت اہم انٹرویو دِیا تھا۔

اپنے انٹرویو میں، مولانا محمد شاہ امروٹی نے دل گرفتہ ہو کر بتایا کہ:

"انگریزوں کو ریشمی رومال کے اِس سفر کی اطلاعات، لحظہ بہ لحظہ مل رہی تھیں۔
اور یہ لنکا، گھر کے ایک بھیدی نے ڈھائی تھی۔ اور یہ تھے: مولانا اشرف علی، تھانوی۔
مولانا امروٹی کے بقول: مولانا تھانوی کہتے تھے کہ:
انگریزوں کے خلاف، کچھ نہ کیا جائے۔
بلکہ ان کی سرپرستی میں رہ کر مسلمانوں کے لئے فوائد، حاصل کیے جائیں۔
وہ، چوں کہ، دارالعلوم دیوبند کے اکابرین میں سے تھے
اِس لئے انھیں، تحریکِ خلافت اور جُنودِ ربّانیہ کے تمام پروگراموں سے آگاہی رہتی تھی۔

انھوں نے ریشمی رومال کی حقیقت اور انقلابی کارروائیوں کے لئے طے کردہ تاریخ سے
اپنے گھر والوں کو آگاہ کر دیا۔ اور ان کے بھائی نے، جو انٹیلی جینس کے ایک افسرِ اعلیٰ تھے
پورے قصے سے انتظامیہ کو باخبر کر دیا۔" (ماہنامہ "شوٹائم" کراچی۔ جلد ۱۔ شمارہ ۸۔ اپریل ۱۹۸۸ء)

یکم محرمُ الحرام ۱۳۶۵ھ/ ۷ /دسمبر ۱۹۴۵ء کو، مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی، سابق صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند و بانی و صدر جمعیۃ العلماء اسلام (متوفی ۱۳۶۹ھ/ ۱۹۴۹ء)

کے مکان (بیتُ الفضل، دیوبند) پر عُلماے دیوبند کے درمیان، پیدا شدہ سیاسی تنازعہ کے حل
کے لئے، ایک اہم میٹنگ، منعقد ہوئی، جس کے شُرکا کے نام، یہ ہیں:
مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی
مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی دیوبندی، وغیرھُم۔

مولانا طاہر احمد قاسمی (برادرِ مولانا قاری محمد طیب قاسمی، مہتمم دارالعلوم دیوبند) نے
اس کی روداد، مرتَّب کر کے بنام "**مکالمۃُ الصَّدرین**" لاہور سے ۱۹۴۶ء ہی میں شائع کر دی تھی
جس کی دہلی و دیوبند وغیرہ سے، بار بار، طباعت و اِشاعت ہو چکی ہے:
عُلماے دیوبند کی اِس اہم اور تاریخی میٹنگ میں ہونے والی گفتگو کے تین اقتباسات، ملاحظہ فرمائیں:

"دیکھیے! حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
ہمارے اور آپ کے مسلَّم بزرگ اور پیشوا تھے۔ ان کے متعلق، بعض لوگوں کو، یہ کہتے سنا گیا ہے کہ:
ان کو، چھ سو روپے ماہوار، حکومتِ ہند کی جانب سے دیے جاتے تھے۔
اِسی کے ساتھ، وہ، یہ بھی کہتے تھے کہ:
گو، مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو، اِس کا علم نہ تھا کہ روپیہ، حکومت دیتی ہے۔
مگر، حکومت، ایسے عنوان سے دیتی تھی کہ ان کو اِس کا شبہ بھی، نہیں گذرتا تھا۔"
(ص ۱۶۔ مکالَمۃُ الصَّدرین۔ مرتَّبہ مولانا طاہر احمد قاسمی۔ مطبوعہ لاہور)

"مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی جماعت کو بھی ابتداءً، حکومت کی جانب سے
بذریعۂ حاجی رشید احمد صاحب کچھ روپیہ ملتا تھا۔ پھر، بند ہو گیا۔"
(ص ۱۶۔ مکالَمۃُ الصَّدرین۔ مرتَّبہ مولانا طاہر احمد قاسمی۔ مطبوعہ لاہور)

"کلکتہ میں جمعیۃ العلماے اسلام، حکومت کی مالی امداد اور اس کے ایما سے قائم ہوئی ہے۔" الخ۔
(ص ۱۶۔ مکالَمۃُ الصَّدرین۔ مرتَّبہ مولانا طاہر احمد قاسمی۔ مطبوعہ لاہور)

اور تحریکِ خلافت (۱۹۱۹ء) و تحریکِ عدمِ تعاون (۱۹۲۰ء) کے بعد
دارالعلوم دیوبند کی ہندو نوازی و کانگریس نوازی کا، یہ عالَم تھا کہ:

مولانا شبیر احمد عثمانی، دیوبندی، سابق صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند (متوفی ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء)
بیان کرتے ہیں:

"درسِ حدیث میں خدا و رسول کی اطاعت کا درس، نہیں دیا جاتا۔

اب، تفسیرِ جلالین، بیضاوی اور درسِ حدیث میں، کانگریسیت کا سبق پڑھایا جانے لگا ہے۔
مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کے کارناموں کی، نہ صرف تعریف کی جاتی ہے
بلکہ ان کی تائید، قرآن وحدیث سے پیش کی جانے لگی ہے۔
درسِ حدیث کا شاید ہی کوئی دن، ایسا گذرتا ہوگا
جس میں کانگریس کا تذکرہ اور اس میں شمولیت کی تلقین نہ کی جاتی ہو۔
ان ہی تقریروں اور، رات دن کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ:
آج، دار العلوم، نہ صرف، ہنود کا مدّاح ہے، بلکہ ان کے رنگ میں بہت کچھ رَنگا جا چکا ہے۔''
(اخبار ''وحدت'' دہلی۔ شمارہ ۲۳/ دسمبر ۱۹۳۷ء۔ وص ۴۔ اخبار ''دبدبۂ سکندری''۔ رام پور۔ شمارہ ۵/ نومبر ۱۹۴۵ء)

بہر حال! اب واپس چلیے اصل موضوع، یعنی مولانا وزیر خاں، بہاری، اکبر آبادی کے بعد سرزمینِ بہار کے دوسرے عالمِ جلیل و رجلِ عظیم کے تذکرہ کی طرف، جو بیسویں صدی عیسوی کے نصفِ اول میں صرف، سرزمینِ بہار کی شان نہیں، بلکہ علی گڑھ کے ماحول میں اپنی دینی وعلمی وفکری فضیلتوں اور نمایاں اخلاقی خوبیوں کے ساتھ، علمائے سَوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کی عظمتوں کا نشانِ امتیاز بن کر، کوہِ وقار کی طرح، سربلند وسرفراز، رہا۔

سرزمینِ بہار کی وہ دوسری عظیم المرتبت شخصیت، جس کا زیرِ نظر تحریر میں مختصر تعارف وتذکرہ، مقصود ہے، وہ، حضرت مولانا سید سلیمان اشرف (متوطّن، محلّہ میر داد بہار شریف۔ ضلع پٹنہ۔ موجودہ ضلع نالندہ) کی ذاتِ گرامی ہے۔

ابتدائی عربی وفارسی تعلیم کے بعد مولانا سید سلیمان اشرف کی ساری تعلیم وتربیت، مدرسہ حنفیہ جون پور میں حضرت علاّمہ ہدایت اللہ، رام پوری ثم جون پوری (وصال ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء) کے سایۂ عاطفت میں ہوئی۔

امامُ الحکمۃِ والکلام، علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی (وصال صفر المظفر ۱۲۷۸ھ/ ۲۰/ اگست ۱۸۶۱ء۔ در جزیرۂ انڈمان و نِکو بار) کے چار مخصوص وممتاز تلامذہ میں
حضرت مولانا سید سلیمان اشرف کے استاذِ محترم، علاّمہ ہدایت اللہ، جون پوری کی نمایاں حیثیت ہے۔ جن کے اَسمائے گرامی، درج ذیل ہیں:
(۱) علاّمہ عبد الحق، خیر آبادی (وصال ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء۔ فرزند وتلمیذِ علاّمہ فضلِ حق، خیر آبادی)

(۲) علاّ مہ عبد القادر، عثمانی، قادری، بدایونی (وصال ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء)

(۳) علاّ مہ ہدایت اللہ، جون پوری (وصال ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء)

(۴) مولانا فیض الحسن، سہارن پوری (وصال ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۷ء)

جون پور کا ایک مشہور واقعہ، مولانا سید سلیمان اشرف کے ایک شاگرد اور اردو زبان کے صاحبِ طرز ادیب، پروفیسر رشید احمد صدیقی (متوفی ۱۹۷۷ء۔ علی گڑھ) اِس طرح تحریر کرتے ہیں کہ:

''تیس (۳۰) سال سے زیادہ کا زمانہ گذرا۔ جون پور میں سیرتِ رسول کی تقریب تھی۔

مرحوم (سید سلیمان اشرف) کی تقریر ہورہی تھی۔ زبردست اجتماع تھا۔

مرحوم (سید سلیمان اشرف) اپنے والہانہ جوش وَ وارفتگی کے ساتھ، تقریر کر رہے تھے۔

حاضرین کی خاموشی کا، یہ عالَم تھا کہ جیسے سارا مجمع، ایک ہی متنفّس ہو۔

اتنے میں دور سے ایک بوڑھا، پستہ قد، منحنی شخص، جُھکا ہوا، اَنبوہِ کثیر کو چیرتا ہوا، بڑھتا نظر آیا۔

جس شخص کے پاس سے گذرتا، وہ خوف وعقیدت سے سمٹ کر تعظیم دیتا۔

دیکھتے دیکھتے۔ پلیٹ فارم (اسٹیج) پر پہنچ گیا۔

مرحوم (سید سلیمان اشرف) کو، سینے سے لگا کر پیشانی کو بوسہ دیا اور واپس چلا گیا۔

یہ، مولانا ہدایت اللہ خاں جون پوری، مرحوم (سید سلیمان اشرف) کے استاذ تھے۔

اور جون پور میں اُس وقت، علم وفضل کے چشم وچراغ تھے۔

مرحوم (سید سلیمان اشرف) میں، اپنے استاد (مولانا ہدایت اللہ جون پوری) کا جبروت وطَنطنہ تھا۔ مرحوم کو، جھک کر اور گول مول باتیں کرتے، کبھی نہیں پایا۔''

(ص ۲۶۔ ''**گنج ہائے گراں مایہ**'' از پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹید۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۲۵)

مولانا سید سلیمان اشرف (وصال ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء۔ مدفون علی گڑھ)

سرزمینِ بہار ہی کے کسی بزرگ سے سلسلۂ چشتیہ نظامیہ میں نسبتِ بیعت وارادت، رکھتے تھے۔

آپ کو اجازت وخلافت، فقیہِ اسلام، امام احمد رضا، قادری برکاتی، بریلوی (۲۵ر صفر ۱۳۴۰ر ۲۸ر اکتوبر ۱۹۲۱ء۔ بروز جمعہ) سے بھی حاصل تھی۔

سَوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کے آپ، بلند پایہ مفکّر ومدبّر عالمِ دین تھے۔

عقائد ومعمولاتِ اہلِ سنّت کے مکمل پابند ہی نہیں، بلکہ ان کے داعی وَ مبلّغ وترجمان بھی تھے۔

دینی وفکری اِصابت واِستقامت اور حق گوئی، آپ کا طُرّہ ٔ امتیاز تھا۔

تحریکِ خلافت (۱۹۱۹ء) وتحریکِ ترکِ موالات (۱۹۲۰ء) وتحریکِ ہجرت (۱۹۲۰ء) وغیرہ کے سنگین بُحرانی دَور میں بھی آپ، ہر مسئلہ میں صحیح وصائب فکرِ اسلامی پر، جبلِ مستقیم کی طرح، قائم رہے۔

اور اِن سبھی مسائل ومعاملات واُمور میں آپ اپنے مُرشدِ اجازت وخلافت، فقیہِ اسلام، امام احمد رضا کے مسلک وموقف کے مؤیّد وحامی ہی نہیں، بلکہ ان کے مُستند شارح اور نمائندۂ ذی وقار بھی تھے۔

صدر یار جنگ، مولانا نواب حبیب الرحمٰن خان، شیروانی علی گڑھی (متوفی شوال ۱۳۶۹ھ/اگست ۱۹۵۰ء) کی، پٹنہ (بہار) میں، مولانا سید سلیمان اشرف سے ایک ملاقات وگفتگو ہوئی۔

جس سے متأثر ہوکر، انہوں نے آپ کو علی گڑھ آنے کی پیش کش کی۔

حافظ غلام غوث، نبیرۂ علاّ مہ ہدایت اللہ، جون پوری لکھتے ہیں:

''ایم اے او کالج، علی گڑھ میں دینیات کے ایک لکچرر کی ضرورت تھی۔

مولانا (سید سلیمان اشرف) کو اطلاع دی گئی۔ انٹرویو میں ''مُعجزہ'' پر مقالہ لکھنے کی فرمائش کی گئی۔ اور ساتھ ہی کہا گیا کہ:

کتابوں کی ضرورت ہو، تو (کتب خانہ) حبیب گنج (علی گڑھ) تشریف لے جائیں۔

مولانا نے فرمایا: بِحَمْدِ اللّٰہ! مجھے کتابوں کی ضرورت نہیں ہے۔

صرف کاغذ اور قلم، دَوات، مہیّا کر دیا جائے۔''

چنانچہ، نمازِ عشا کے بعد سے صبح تک، ایک ہی مجلس میں، بائیس (۲۲) فل اسکیپ صفحات پر مدلّل مضمون، قلمبند کر دیا۔ جسے بہت پسند کیا گیا۔

پھر، نمازِ جمعہ کے بعد ''توحید'' پر خطاب کرنے کے لئے کہا گیا

تو آپ نے تین گھنٹے تک، اِس موضوع پر تقریر فرمائی، جسے سُن کر پرستارانِ توحید، جھوم اٹھے۔

اِس تقریر میں دینیات کمیٹی (علی گڑھ) کے تمام اراکین، نواب وقارُ الملک مشتاق حسین اور مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی، موجود تھے۔

اسی دن، پچاس روپے ماہوار پر، آپ کا تقرر کر دیا گیا۔''

(سہ ماہی ''العلم'' کراچی۔ شمارہ اپریل تا جون ۱۹۷۴ء۔ بقلم حافظ غلام غوث، نبیرۂ علاّ مہ ہدایت اللہ، جون پوری)

علی گڑھ کالج میں مولانا سید سلیمان اشرف کی، یہ تقرُّری ۱۹۰۲ء میں ہوئی۔

اِس تقرُّری کا ذکر کرتے ہوئے مولانا حبیب الرحمٰن، شیروانی، علی گڑھی، خود لکھتے ہیں کہ:

''نواب وقارُ الملک کے زمانے میں علی گڑھ کالج میں پروفیسرِ دینیات کا عُہدہ، قائم ہوا۔

سید سلیمان اشرف کا تقرُّر، بہ حیثیت پروفیسرِ دینیات، عمل میں آیا۔

درسِ قرآن و تفسیر کی جماعت، قائم ہوئی۔ اس کا ایک دَور، ختم ہو چکا تھا۔

اُس وقت بھی، عُلمائے کرام، مدعو ہوئے تھے۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی، مولانا ولایت حسین، صاحب الٰہ آبادی اور مولانا عبدالحق حَقّانی (دہلوی) اور بزرگوں سے درخواستِ قُدوم کی گئی تھی۔

چنانچہ، مولانا عبدالحق حقانی صاحب تشریف لائے تھے۔ چند گھنٹے، امتحان لیا تھا۔

جو تحریر، میرے نام، بعدِ امتحان بھیجی تھی، اُس سے واضح ہوتا تھا کہ:

ممدوح کو حیرت انگیز اطمینان ہوا تھا۔" (ص ۸۰۔ **مقالاتِ شیروانی**۔ ۱۹۴۶ء)

علی گڑھ کالج سے مولانا سید سلیمان اشرف کی وابستگی کے بارے میں

خانوادۂ رضویہ، بریلی شریف کے ایک عالمِ جلیل، حضرت مفتی اعجاز ولی خاں، رضوی، بریلوی (ولادت ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء۔ وصال ۱۳۹۳ھ/۱۹۷۳ء) شیخ الحدیث جامعہ نعمانیہ، لاہور تحریر فرماتے ہیں:

"آپ، اعلیٰ حضرت قُدِّسَ سِرُّہٗ کے حسبِ ارشاد، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے منسلک ہوئے۔ آپ، رُشد و ہدایت کے پیکر، صداقت و دیانت کے مُجسَّمہ تھے۔ سیاسی بصیرت میں، لاثانی تھے۔"

(ص ۳۱۔ **مقالاتِ یومِ رضا**، حصہ سوم۔ مطبوعہ لاہور۔ ۱۹۷۱ء)

یہاں، تھوڑی دیر، رُک کر، امامِ اہلِ سنّت، مولانا الشاہ احمد رضا قادری برکاتی بریلوی **قُدِّسَ سِرُّہٗ** کی خدمت میں ہدیۂ تحسین و تبریک پیش کیجیے

اور آپ کی بصیرت و مستقبل شناسی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے چلیے کہ:

آپ کی نظر، کتنی وسیع و ہمہ گیر تھی؟

مزید برآں، ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء کا تحریر کردہ، یہ مکتوبِ گرامی پڑھ کر

امام احمد رضا کے ذہنِ اَرجمند اور فکرِ بلند کے تصور سے اپنا دیدہ و دل، روشن و منور کر لیجیے کہ:

آپ، حضرت مولانا محمد ظفر الدین قادری رضوی عظیم آبادی (وصال ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء) کی ذہن سازی، کس طرح فرما رہے ہیں۔ اور بارگاہِ رضوی سے انہیں کیا ہدایت مل رہی ہے؟

(اِس مکتوبِ رضوی میں "حاجی صاحب" سے مراد، حاجی لعل محمد، وَیلوری، مدراسی، متوفی ۱۵/ذوالقعدہ ۱۳۳۹ھ/۲۱/جولائی ۱۹۲۱ء۔ کلکتہ ہیں۔

جو کلکتہ کے بہت بڑے تاجر اور مُخیر، مُحسنِ اہلِ سنّت، نیز خلیفۂ امام احمد رضا، بریلوی ہیں)

"کلکتہ میں ایک سُنّی عالم کی بہت ضرورت ہے۔

حاجی صاحب کواللہ، برکات دے۔ تنہا اپنی ذات سے وہ، کیا کیا کریں؟
سنّیوں کی عام حالت، یہی ہو رہی ہے کہ:

’’جن کے پاس، مال ہے، انہیں، دین کا، کم خیال ہے۔
اور جنہیں، دین سے غرض ہے، اِفلاس کا مرض ہے۔‘‘

ورنہ، کلکتہ میں حمایتِ دین کے لئے دو ہزار روپیہ، ماہوار بھی کوئی چیز نہ تھی۔
مدرسہ شمس الھدیٰ، پٹنہ، جس کی نسبت، میں نے سنا ہے کہ:

سولہ ہزار روپے سالانہ کی جائیداد، اس کے لئے وقف ہے۔ اس کا بھی ہاتھ میں رکھنا، ضرور ہے۔‘‘
(مکتوب، مُحرَّرہ ۲۶؍رمضان ۱۳۳۴ھ۔ یوم جمعہ۔ ص ۲۷۰۔ حیاتِ اعلیٰ حضرت، حصہ اول، طبعِ قدیم، کراچی)

مولانا محمد ظفر الدین، قادری، رضوی، عظیم آبادی (متوفی ۱۳۸۲ھ؍۱۹۶۲ء)
تلمیذ وخلیفۂ امام احمد رضا کے صاحب زادے
ڈاکٹر مختار الدین احمد (سابق صدر شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)
اپنے والد ماجد کے مختصر تعارف وتذکرہ میں لکھتے ہیں کہ:
مسٹر سید نورُالھدیٰ، ڈسٹرکٹ سیشن جج نے
جب اپنے والد ماجد، سید شمس الھدیٰ کے نام پر ۱۳۳۰ھ؍مطابق ۱۹۱۲ء میں
مدرسہ شمس الھدیٰ، قائم کیا
تو اس میں بحیثیت مدرسِ اول، ان کا تقرر، عمل میں آیا۔ جہاں وہ، تفسیر وحدیث وفقہ کا درس دینے لگے۔
۱۳۳۴ھ؍۱۹۱۶ء میں سہسرام ضلع شاہ آباد، بہار جاکر، وہاں کئی سال، درس وتدریس میں مصروف
رہے۔ **۱۳۳۸ھ؍۱۹۲۰ء میں، جب مسٹر سید نورالھدیٰ نے**
مدرسہ شمس الھدیٰ کو حکومتِ بہار کے انتظام میں دے دیا، تو نئی تقرّری میں
مولانا ظفر الدین، قادری، وہاں، سینئر مدرس ہو کر آئے۔
اور ۱۹۴۸ء میں وہ، پرنسپل کے عہدہ پر سرفراز ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔‘‘
(اَخذ و اِقتباس۔ از ص ۶۰ و ص ۶۱۔ تعارف بعنوان ’’صاحبِ کتاب‘‘۔ حیاتِ اعلیٰ حضرت، حصہ اول۔
مطبوعہ رضا اکیڈمی۔ بمبئی)

امام احمد رضا کے خصوصی تلامذہ میں مولانا ظفر الدین قادری رضوی عظیم آبادی
اور مولانا سید عبد الرشید عظیم آبادی، یہ دونوں حضرات، مدرسہ شمس الھدیٰ، پٹنہ کے مدرس تھے۔

انہیں دونوں حضرات کا اہلِ سنَّت و جماعت پر ایک عظیم احسان، یہ ہے کہ:
مسلسل درخواست، تقاضا، اِصرار کر کے امام احمد رضا کے چھوٹے بھائی اور نعت گو شاعر
مولانا حسن رضا، بریلوی (وصال ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء)
آپ کے بڑے صاحب زادے، مولانا حامد رضا بریلوی (وصال ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء)
''مولانا حکیم سید محمد امیر اللہ بریلوی اور دوسرے حضرات کو، اِس خدمت کے لئے تیار کیا کہ:
کسی طرح آپ حضرات، سفارش گزارش کر کے اعلیٰ حضرت کو ایک دار العلوم، قائم کرنے پر آمادہ کریں۔''
مولانا سید امیر بریلوی کو خصوصیت سے اِن دونوں حضرات نے اِس خدمت کے لئے آگے
بڑھایا کہ وہ **شاگرد ہونے کے ساتھ، سید بھی ہیں۔**

چنانچہ، مولانا ظفر الدین اور مولانا سید عبد الرشید رَحِمَهُمَا اللہُ تعالیٰ کی تحریک پر
۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء میں، مدرسہ منظرِ اسلام، محلّہ سوداگران، بریلی کا قیام ہوا۔

اور انہیں دونوں حضرات کی تعلیم سے مدرسہ کا اِفتتاح بھی ہوا۔ اور ان دونوں حضرات نے
امام احمد رضا سے بخاری شریف پڑھنے کے ساتھ، فتویٰ نویسی کی تربیت، حاصل کرنی شروع کی۔
بات، کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہے؟ ذِکر تھا، بہار کی دو عظیم شخصیتوں کا
اور درمیان میں بہار ہی کی دو مؤخَّر الذکر، نئی شخصیتیں آ گئیں۔ مگر، یہ بھی اپنے دَور میں
سرزمینِ بہار کی ایسی دو عظیم شخصیتیں ہیں کہ انہیں کی تحریک سے اور انہیں کی کدّ و کاوش سے
مدرسہ منظرِ اسلام، بریلی کا قیام، عمل میں آیا۔
جس کی درس گاہ سے اہلِ سنَّت کے بڑے بڑے عُلما و فُضَلا، فارغُ التحصیل ہوئے۔
حضرت مولانا سید سلیمان اشرف کی دینی فکر و بصیرت، حالات کا عمیق مطالعہ، اِصابتِ رائے
مستقبل کے اثرات و نتائج پر گہری نظر، جرأت و اِستقامت، وغیرہ
اِن جملہ اوصاف و کمالات کے روشن نقوش، آپ کی مندرجہ ذیل تحریروں میں ملاحظہ فرمائیں۔
اور اِس کے لئے ضروی ہے کہ:
تحریکِ خلافت (۱۹۱۹ء) و تحریکِ تَرکِ موالات (۱۹۲۰ء) کا ہنگامہ خیز دَور، پیشِ نظر رکھیں:

''مسلمانوں کا ایک عہد، عیسائیت کے ساتھ، تعَشُّق و شیفتگی کا تھا۔
مسلمان، ہمہ تن، اوس میں حُلول و جَذب ہو جانے کے لئے بیتاب تھے۔

لیڈرانِ قوم نے اوس وقت، نہایت بلند آہنگی سے، یہ صُور پھونکا تھا کہ:

اگر، باعزت وحُرمَت، دنیا میں رہنا چاہتے ہو، تو یورپ میں جَذب ہو جاوَ۔
مسلم ہستی، بذاتِ خود، قایم ہو ہی نہیں سکتی۔ اسلامی انداز، جلد سے جلد چھوڑ دو
اور یورپ کے اسلوب، اختیار کرو۔
پھر، کیا تھا۔ مسلمانوں کی شکل وصورت، لباس وپوشاک، طرزِ ماندوبود
غرض، ہر ایک شعبۂ حیات میں یورپ ہی کی تجلّی تھی۔
حتّٰی کہ نام تک، یورپین تلفُّظ واِملا میں شامل کر لیا گیا۔
ارکانِ اسلام سے بے گانہ وَشی، لَوازمِ تہذیب وتعلیم، قرار پائی۔
اب، چند سال سے ایک نیا دَور، شروع ہوا۔ مسلمانوں نے دوسری کروٹ بدلی
تو اِس کی تلاش ہوئی کہ:
اِس مرتبہ، کس قوم میں مِل کر فنائے کُلّی کا مرتبہ، حاصل کیا جائے؟
تا کہ رہی سہی علامتِ اسلامی بھی، مِٹ جائے۔
بارے، اِس مرتبہ، زیادہ سرگردانی کی نوبت نہ آئی۔
نہایت اطمینان سے اوس میں جَذب ہونا شروع ہوئے۔
پاس ہی ملک میں ایک ہم سایہ قوم مِل گئی۔
لیڈروں نے پھر، اوسی تلقین کا اِعادہ کیا کہ:
تم، ہیچ۔ تمہارے مذہبی دستورُ العمل، ہیچ۔ تمہارے اسلاف کے کارنامے، ہیچ۔
خبردار! مسلم ہستی کو، بذاتِ خود قیام کی کوشش، سخت حماقت و بے غیرتی ہے۔
یہ زَرّیں موقع، ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ احسان مانو کہ:
اپنی رہی سہی قومیت، مٹانے کے لئے ہمیں دور، نہ جانا پڑا۔
خود اپنے ہم سایہ میں ایک ایسی قوم مِل گئی، جس میں جَذب ہو کر ہم، نیست ونابود ہو سکتے ہیں۔
مسلمانوں نے بھی لیڈروں کی اِس تلقین پر لبیک کہا۔
اِس دَور سے پیشتر، عیسائیت میں جَذب ہونے کے لئے مسائلِ شرعیہ میں طرح طرح کی تحریفیں کی گئیں۔ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی کے مطالب میں عجیب وغریب معنیٰ آفرینیوں سے کام لیا گیا۔
اِس دَورِ جدید میں ہندوؤں کے لئے وہی باتیں کہی جارہی ہیں۔

مذہب کا بہت بڑا حصہ، یورپ پر نچھاور کیا جاچکا تھا۔

جو باقی تھا، وہ، نہایت فیاضی سے ایک ''شریف قوم'' نے پہلے ہی قدمِ اتحاد پر قربان کردیا۔

اب کہ اہلِ ہنود نے زبانی ہم دردی، مسئلۂ خلافت میں مسلمانوں سے ظاہر کی ہے۔

ایک دو ہندوؤں نے یہ بھی کہہ دیا کہ ہم، مسلمانوں کے ساتھ، سر دینے کو موجود ہیں۔

ان پُرکیف نغمات پر مسلمان، تاسُّف وتحسُّر سے ہاتھ، مَل رہے ہیں کہ:

اب کیا باقی رہا، جسے اس کے معاوضہ میں قربان کیا جائے۔

افسوس ہے مسلمانوں کی بدعقلی اور خام کاری پر کہ:

دنیا طلبی، ان پر ایسی چھائی کہ دین کی تباہی، اپنے ہاتھوں سے کرنے لگے

اور اس کا اِحساس وشعور تک ان میں نہیں ہوتا کہ ہم، کیا کررہے ہیں؟

مسلمانوں کا حقیقی نَصبُ العین، دین ومذہب، اللہ نے قرار دیا ہے۔

دنیا، ان کے پاس، دین کی رونق اور مذہب کی خدمت کے لئے ہے۔

جب، دین ومذہب ہی نہ رہا

تو، ملعون ہے وہ سلطنت، جو ایمان کے عوض ملے۔

اور صد ہا لعنت ہے اوس حکومت پر، جو اسلام، بیچ کر خریدی جائے۔'' الخ۔

(ص ۸ تا ۱۰۔ **اَلرَّشاد**۔ مؤلّفہ مولانا سید سلیمان اشرف۔ مطبوعہ، مطبع انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ کالج، علی گڑھ۔ ۱۳۳۹ھ/۲۰۔۱۹۲۱ء)

''یہ عجیب کشاکش کا دَور، ہندو مسلمان، دونوں کے لئے تھا۔

..........اِس عُقدۂ لاینحل کو مسٹر گاندھی نے اپنے ناخنِ تدبیر سے ایسا سلجھایا کہ مسلمانوں کی عقلیں اُلجھ گئیں۔ اسی الجھن میں مسلمانوں نے اتحاد کا ہاتھ بڑھانے سے پیشتر، مدغم ہوجانے کی کوشش کی۔

قَشْقَہ کھینچا۔ مندروں میں گئے۔ چڑھاوے، چڑھائے۔ بتوں پر پھولوں کا تاج رکھا۔

گئو ماتا کی جے پکاری۔ قربانیِ گاؤ سے توبہ کی۔ منبر ومکبَّر پر، ہنود کو تبلیغ وہدایت کے لئے جگہ دی۔

اب، مضامین لکھے جاتے ہیں۔ کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ وعظ کہے جاتے ہیں۔

جن کا موضوع، یہ ہوتا ہے کہ کفَّار ومشرکین میں جَذب ہوجانا، عینِ اسلام ہے۔''

(ص ۳۰۔ اَلـــنُّـــور۔ مؤلّفہ مولانا سید سلیمان اشرف۔ مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج، علی گڑھ۔

۱۳۳۹ھ/۲۱۔۱۹۲۰ء۔طبعِ جدید (بنامِ توضیح:موالات و معاملات کا شرعی حکم)رضا اکیڈمی۔ بمبئی۔ ۱۴۳۱ھ/۲۰۱۰ء)

''غالباً،خلافت کے متعلق،تم،یہ جواب دوگے کہ:

اب، یہ مسئلہ، طے ہو گیا کہ:

جب تک ہندوستان ،آزاد نہ ہو، اور انگریزوں کا قدم، یہاں سے نہ ہٹے

مسلمان، کچھ بھی خلافت کی مدد،نہیں کر سکتے ہیں۔

ہاں! میں بھی،تو یہی کہتا ہوں کہ:

پہلے،خلافت کے لئے ہندوتک سرگرمِ کار تھے۔لیکن،اِسی قلیل مدت میں،یہ تبدیلی ہوئی کہ:

خود،مسلمان، بجائے خلافت''سوراج'' پکارنے لگے۔

شاید،گاندھی کے باب میں،تم ،یہ جواب دو کہ:

جب تک مسلمانوں میں کوئی صاحبِ سجادہ،کوئی خانقاہ نشین،کوئی واعظ وفقیہ

کوئی محدِّث ومفسِّر ،حد یہ ہے کہ کوئی جنٹل مَین لیڈر،مثل گاندھی کے نہ ہو

تو ہمیں ،اِس کے سِوا،کوئی چارہ ہی کیا ہے کہ ہم ،اُسی کی تقلید کریں؟

ہاں! میں بھی،تو یہی کہتا ہوں کہ:

گاندھی،تمھارا پیشوا ہے اور تم اُس کے پَیرو.....

ہاں! میں بھی،تو یہی کہتا ہوں کہ تم اُس میں جَذب ہو گئے۔الخ۔

(ص ۴۹۔ **النُّور**۔مؤلّفہ مولانا سید سلیمان اشرف۔مطبوعہ علی گڑھ۔۱۳۴۰ھ/۲۱۔۱۹۲۰ء۔ولاہور وبمبئی)

بہر حال! حضرت مولانا سید سلیمان اشرف اپنی دینی عظمت واِستقامت،علمی وقار واِعتبار،حق شناسی وحق گوئی،فکر وبصیرت،اِستغنا وبے نیازی،ہر لحاظ سے علی گڑھ کے ماحول میں اپنی مثال آپ تھے۔

جس کا اندازہ''**بارگاہِ سلیمانی**'' کے مستقل حاضر باش

مندرجہ ذیل،اہلِ علم وادب کی مختصر فہرست سے ہوتا ہے:

صدر یار جنگ،مولانا نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی،محمد مقتدیٰ خاں شیروانی، پروفیسر رشید احمد

صدیقی، ڈاکٹر بُرہان احمد فاروقی، مولانا فضل الرحمٰن، انصاری، ڈاکٹر سید بدرُ الدین علوی، ڈاکٹر سید عابد احمد علی، محمد اَنوار صمدانی، محمد اِکرام اللہ خاں، مولانا ابوبکر، سید زینُ الدین، سید بہاء الدین وغیرھُم۔

بارگاہِ سلیمانی کی پُر وقار یومیہ مجلس کا ذکر کرتے ہوئے

مولانا سید سلیمان ندوی (متوفی ۱۹۵۳ء) لکھتے ہیں:

''مرحوم، خوش اَندام، خوش لباس، خوش طبع، نفاست پسند، سادہ مزاج، بے تکلُّف تھے۔
ان کی سب سے بڑی خوبی، ان کی خودداری اور اپنی عزتِ نفس کا پاس تھا۔
ان کی ساری عمر، علی گڑھ میں گذری، جہاں اُمَرَا، واَربابِ جاہ کا تانتا لگا رہتا ہے۔
مگر، انہوں نے کبھی، کسی کی خوشامد نہیں کی۔ اور، نہ ان میں سے کسی سے دَب کر، یا جُھک کر ملے۔
جس سے ملے، برابری سے ملے اور اپنا عالمانہ وقار، پوری طرح ملحوظ رکھ کر۔
علی گڑھ کے سیاسی انقلابات کی آندھیاں بھی، ان کو اپنی جگہ سے نہ ہلا سکیں۔
ان کی قیام گاہ، ایک ''دوریش کی خانقاہ'' تھی۔ جو آتا، جھک کر آتا۔ الخ۔

(ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ۔ شمارہ جون ۱۹۳۹ء۔ بقلم سید سلیمان ندوی)

مولانا نواب، حبیب الرحمٰن خاں، شیروانی، علی گڑھی کی مستقل حاضریِ بارگاہِ سلیمانی کا ذِکر تے ہوئے، مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''پابندیِ وضع کی ایک خاص یادگار، علی گڑھ میں مولانا سید سلیمان اشرف کی قیام گاہ میں اَخیر وقت کی مستقل حاضری تھی، جو مغرب تک جاری رہتی۔
جب وہ آتے، یہ حاضری، بلا دَغدغہ، ہر موسم میں اور ہمیشہ رہی۔''

(ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ۔ شمارہ جون ۱۹۳۹ء)

آپ کے شاگرد اور بارگاہِ سلیمانی کے مستقل حاضر باش، پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''یونیورسٹی میں بڑے لوگوں کی آمد پر جشن منایا جاتا، جلسے ہوتے۔
مرحوم (سید سلیمان اشرف) ان میں کبھی، شریک نہ ہوئے۔
اس پر، اکثر پیچیدگیاں بھی پیدا ہوئیں۔ لیکن، مرحوم، اپنی جگہ سے ذرا بھی، اِدھر اُدھر نہ ہوئے۔
کہتے تھے: یونیورسٹی میں دولت وامارت کا کیا ہیچ؟
ایسے لوگوں کے لئے ساری دنیا پڑی ہے۔ وہیں، یہ ڈھونگ، اچھا معلوم ہوتا ہے۔
یہاں، علم وفضل دیکھا جاتا ہے۔ کوئی صاحبِ فضل وکمال آئے، تو البتّہ!

(چند سطروں کے بعد) مرحوم (سید سلیمان اشرف) مذہبی معتقدات میں بڑا غُلو، رکھتے تھے۔
اظہار کا موقع آتا تو کُھلَّم کُھلاً، ان کا اعلان بھی کر دیا کرتے تھے۔''
(ص۴۲و ص۴۳۔''گنج ہائے گراں مایہ''۔از پروفیسر رشید احمد صدیقی۔مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر۔نئی دہلی ۲۵)
''علم و مذہب پر گفتگو کرتے کرتے، اکثر جلال میں آجاتے۔لیکن، اس کی شان ہی کچھ اور ہوتی۔
ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے وہ علم، یا مذہب کے بَل پر، یا۔ان کے ناموس کی حفاظت میں آمادۂ جہاد ہیں۔
تکبُّر، یا تبختُر کا شائبہ تک نہ ہوتا۔
اور جب، بے تکلُّف دوستوں کے حلقے میں ہوتے
تو اُن کی باتوں میں شگفتگی، رنگینی و زیبائی ہوتی۔
مرحوم، یاد آتے ہیں تو ''عجم کا حُسنِ طبیعت، عرب کا سوزِ دروں'' کا نقشہ، پھر جاتا ہے۔''
(ص۴۵۔''گنج ہائے گراں مایہ''۔از پروفیسر رشید احمد صدیقی۔مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر۔نئی دہلی ۲۵)
''مرحوم، جسے دوست رکھتے، اُس سے نہایت خوش ہوکر، آگے بڑھ کر، جی کھول کر ملتے
اور کوئی خوش دِلی کا فِقرہ، ضرور کہتے۔
مرعوب ہونا، جانتے ہی نہ تھے۔کسی کے علم سے، نہ کسی کی دولت سے، نہ کسی کے اِقتدار سے۔
مذہبی عقائد میں کٹَّر، سلوک میں بے لوث۔
جو جتنا چھوٹا ہوتا، اُس سے اتنی ہی فروتنی سے ملتے۔بڑا ہوتا، تو اُسے سے کہیں، بڑا ہوکر ملتے۔
علم کا وقار، اُن کے دَم سے تھا۔معزَّز و محبوب مولوی، میں نے اُن ہی کو پایا۔''
(ص۳۰۔''**گنج ہائے گراں مایہ**''۔از پروفیسر رشید احمد صدیقی)
''آواز میں کڑک اور لچک دَھمک بھی۔خطابت پر آتے تو معلوم ہوتا کہ صفیں، اُلٹ دیں گے۔
نماز پڑھاتے تو معلوم ہوتا کہ:
خدا کا کلام، دوسروں کو پہنچانے میں، اپنی اور اپنے مالک، دونوں کی عظمت کا احساس ہے۔
جمعہ کی ایک نماز، یاد ہے۔جاڑے کے دن تھے۔تخ بَھری ہوائیں۔
ایسا معلوم ہوتا کہ گویا، رگ و ریشے میں سوئیاں بن کر اُتر جاتی ہیں۔
.......مرحوم، امامت کے لئے آگے بڑھے۔تکبیر، ختم نہیں ہوئی تھی کہ مولانا نے کہا: اَللّٰہُ اکبر۔
ایسا معلوم ہوا کہ اِس صدا نے فضا کی ہر صدا کی لرزش، چھین لی۔
اس کے بعد، جو قرأت شروع کی ہے، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے:

خالد کی تلوار، میدانِ جہاد میں کوندتی، لرزتی، گرتی، لچکتی، کاٹتی، سمٹتی
تیرتی، اُبھرتی آگے بڑھتی چلی جارہی ہے۔
کوئی لمبی سورت تھی۔ جب تک ختم نہ ہوئی، یہ معلوم ہوتا تھا، جیسے جسم وجان میں بجلیاں بھر گئی ہیں۔
اور شوقِ خودسپاری میں، ہمیں نہیں، درودیوار بھی جھوم رہے ہیں۔
اُس وقت کی نماز، اب بھی یاد ہے۔ اور یہ بھی کہ وقت آ گیا
تو شوقِ شہادت، دنیا کے ہر نشیب وفراز اور زندگی کے ہر تأمل وتذبذب کو خس وخاشاک کی طرح
بَہالے جائے گا۔
مرحوم، ایسوں سے کبھی علمی گفتگو نہ کرتے جن کے بارے میں ان کو یقین ہوتا کہ اس کو علم کا
گھمنڈ ہے۔ یا علم کی گہرائی، یا وزن، نصیب نہیں ہے۔ یا صرف، دنیوی اِقتدار کا حامل ہے۔
اگر، کوئی چھیڑ بھی دیتا تو ٹال جاتے۔ ورنہ صاف کہہ دیتے کہ:
کوئی دوسری بات کیجیے۔ آپ کو اِن باتوں سے کیا سروکار؟
''اَلْمُبِین'' شائع ہوئی تو اس کا ایک نسخہ، ڈاکٹر اقبالؔ مرحوم کو بھیجا۔
اتفاق سے کچھ ہی دنوں بعد، اقبالؔ مرحوم اپنے لکچروں کے سلسلے میں علی گڑھ، تشریف لائے۔
کھانے پر ایک جگہ، مرحومین کی ملاقات ہوگئی۔
اَلْمُبِین کا ذکر، چھڑ گیا۔ سر اقبالؔ نے بڑی تعریف کی اور فرمایا:
مولانا! آپ نے عربی زبان کے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے
جن کی طرف، پہلے میرا ذہن، منتقل نہیں ہوا تھا۔''
(ص ۳۰ وص ۳۱۔ ''گنج ہائے گراں مایہ''۔ از پروفیسر رشید احمد صدیقی)
''آج، کم وبیش گیارہ سال ہوئے، یونیورسٹی پر تحقیقاتی کمیٹی، بیٹھ چکی تھی۔
ہر طرف، سراسیمگی، چھائی ہوئی تھی۔ نفسی نفسی کا عالَم تھا۔
بڑے بڑے سورماؤں کے پاؤں، لڑکھڑانے لگے تھے۔
اُس وقت کا حال، کچھ وہی لوگ جانتے ہیں، جن پر وہ حال گذر چکا ہے۔
اُس زمانے میں مولانا کو دیکھا۔ کیا مجال کہ روزمَرَّہ کے معمولات میں فرق آ جاتا۔
جن کے بارے میں جو رائے رکھتے تھے، اُس کا علیٰ الِاعلان، اظہار کرتے۔
ایک شب، مَیں حاضر ہوا۔ مرحوم کی خدمت میں اکثر ایسی باتیں بھی کہہ جاتا

جو دوسرے، کہنے سے ہمیشہ، تأمُّل کرتے۔

عرض کیا: مولانا! کیا ہونے والا ہے؟ خدانخواستہ، نوعِ دیگر ہوا، تو کیا ہوگا؟

کہنے لگے: رشید! تم بھی، ایسا کہتے ہو؟ مجھے خیال تھا کہ تم، اِس قسم کا ذکر نہ چھیڑو گے۔

ہوگا کیا؟ وہی ہوگا، جو ازل سے تقدیر ہو چکا ہے۔

مومن کی شان، یہی ہے کہ اُس پر، ہَراس، طاری نہ ہو۔

تم، ڈروگے تو اُن کا کیا حال ہوگا، جو تم کو اپنا سردار سمجھتے ہیں؟

جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا ہے۔ پھر ڈرنے، جھجھکنے سے کیا فائدہ؟

مرحوم پر، اُس وقت، جلال سا، طاری تھا۔

شہنشاہِ رُوما کا وہ عہد، یاد آ گیا جب ''گارگس'' نے روم پر قبضہ کیا

اور وحشیوں نے فتح کے نشے میں آ کر سینٹ کا رُخ کیا۔ جہاں کا ہر رُکن اپنی متانت اور وقار کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ جن میں سے ہر ایک کو وحشیوں نے نشِست ہی پر، ذبح کر ڈالا۔

لیکن، سینٹرس نے اپنی جگہ چھوڑی، نہ آہ وزاری کی۔

وہ دن گذر گئے۔ جو ہونے والا تھا وہ بھی ہو چکا۔ مرحوم بھی جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔

آج، اِس زمانے پر نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ:

کیسا مَرد تھا؟ کیسا سردار تھا؟ جو ہم سے چھین لیا گیا۔ مرحوم میں سرداری کی بڑی بڑی باتیں تھیں۔

تحقیقاتی کمیٹی کا زمانہ، کوئی معمولی زمانہ، نہ تھا۔ اُس وقت، صرف مرحوم کی ذات ایسی تھی

جو پہاڑ کی طرح، اپنی جگہ، قائم تھی۔

مجھے، یقین ہے کہ مرحوم، زندہ ہوتے اور ان کی تاریخی دومنزلہ عمارت پر دشمن کے ہوائی جہاز، بَم برساتے ہوتے، تو بھی ان کے معمولات میں کوئی فرق نہ آتا۔''

(ص ۲۲ تا ص ۲۴۔ ''گنج ہائے گراں مایہ''۔ از پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵)

مولانا سید سلیمان اشرف، اپنی فکرِ مستقیم، بصیرت وژرف نگاہی اور اِستقامتِ رائے میں طبقۂ عُلماے کرام میں، ممتاز ومنفرد حیثیت کے مالک اور پُر وقار وباوزن شخصیت کے حامل تھے۔

یہی وجہ ہے کہ اکابر عُلماے کرام کی موجودگی میں بھی صدارت ونمائندگی کا قرعۂ فال آپ ہی کے نام نکلتا تھا۔ جس کے کئی ایک مستند تاریخی شواہد، میرے علم ومطالعہ میں ہیں۔

ذیل میں ان کی چند جھلکیاں، ملاحظہ فرمائیں:

بُرہانِ مِلّت، حضرت مولانا مفتی محمد عبد الباقی بُرہان الحق، رضوی، جبل پوری (وصال ۱۴۰۵ھ / ۱۹۸۴ء) خلیفۂ امام احمد رضا بریلوی تحریر فرماتے ہیں:

''رجب شریف ۱۳۳۹ھ / مارچ ۱۹۲۱ء میں، اجمیر شریف، حاضری کے بعد بریلی، حاضر ہوا۔ آستانۂ رضویہ (بریلی شریف) پر چند مقتدر عُلمائے کرام کی مجلسِ شوریٰ ہو رہی تھی۔ مولانا سید سلیمان اشرف (صدر شعبۂ علومِ اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) صدرِ مجلس تھے۔

سب سے سلام و مصافحہ کے بعد، مَیں بھی بیٹھ گیا۔

معلوم ہوا کہ جمعیۃ العُلماء ہند کے اِہتمام سے ابوالکلام آزاد کی صدارت میں ایک کُھلا اِجلاس، بریلی میں ہو رہا ہے۔ جس میں وہ، اِتمامِ حجت کریں گے۔

اِس اَمر کا اظہار انھوں نے مختلف اشتہارات، شائع کر کے کیا ہے۔

.........صدرُ الشریعہ، مولانا امجد علی رضوی صاحب کے مرتَّب کردہ، ستَّر (۷۰) سوالات کا مجموعہ، بنام ''اِتمامِ حجتِ تامّہ'' (۱۳۳۹ھ) شائع ہو کر، اراکینِ خلافت کمیٹی تک پہنچ گیا تھا۔

ابوالکلام آزاد نے ان کوششوں کے برعکس، اعلیٰ حضرت کو جلسہ میں شرکت کی اور رَفعِ نزاع کی دعوت بھیج دی تھی۔

آستانے پر حاضر عُلما ''جماعتِ رضائے مصطفیٰ'' کی طرف سے، اس سے پہلے جمعیۃ العُلماء ہند کے اجلاس میں شرکت کرنے اور رَفعِ نزاع کے لئے ایک زور کا اعلان، بذریعۂ اشتہار کر چکے تھے۔ جو کُھلے اجلاس میں، ابوالکلام آزاد اور خلافتی لیڈروں سے، جا کر گفتگو کرے گا۔

......ابوالکلام آزاد نے (اِجلاسِ بریلی میں) سید سلیمان اشرف کو تقریر کی دعوت دی۔

سید سلیمان اشرف، تقریر کے لئے کھڑے ہو گئے۔ تقریر کے دَوران، انہوں نے اپنا (جماعت رضائے مصطفیٰ کا) موقف، نہایت وضاحت سے بیان کیا۔

اپنے موقف کی حمایت میں قوی دلائل پیش کیے اور ''اِتمامِ حجتِ تامّہ'' کا جواب، طلب کیا۔

آزاد کے کچھ اخباری بیانات، کچھ تقریروں اور بعض حرکات پر شدید اعتراضات کیے۔

اپنی کتاب ''اَلرَّشاد'' اور ایک کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے آزاد سے جواب طلب کیا۔

اور اپنی پوزیشن، صاف کرنے کا مطالبہ کیا۔

آزاد کے پاس، اِن باتوں کا کوئی جواب نہ تھا'' الخ۔

(**اِکرامِ امام احمد رضا**۔ از مفتی محمد برہانُ الحق رضوی، جبل پوری، مطبوعہ پاک و ہند)

اسلامیہ کالج گراؤنڈ، بریلی کے اِس اجلاسِ مارچ ۱۹۲۱ء میں اظہارِ حق کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان اشرف نے فرمایا:

''آپ، ملکی مفاد اور بہبود کے لئے مل کر کوشش کیجیے

مگر، جہاں سے مذہبی حُدود آئیں، مسلمان الگ اور ہندو الگ۔

ہم، اپنے مذہب میں ہندوؤں سے اتحاد، نہیں کر سکتے۔

.........ہندوستان کے مفاد کی کوشش کیجیے۔ اس سے ہمیں، خلاف نہیں۔

خلاف اُن حرکات سے ہے، جو آپ لوگ، منافی ومخالفِ دین کر رہے ہیں۔

ان حرکات کو دور کر دیجیے۔ ان سے باز آجایئے۔ ان کی روک تھام کیجیے۔

عوام کو، ان سے باز رکھیے

تو سلطنتِ اسلامیہ وممالکِ مقدسہ کی حفاظت، ہندوستان کے ملکی مفاد کی کوششیں، ہم بھی آپ کے ساتھ، مل کر، کرنے کو تیار ہیں۔''

مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء) کے پرائیویٹ سکریٹری

مولانا عبدالرزاق، ملیح آبادی، ندوی (متوفی ۱۹۵۹ء) عینی شاہد کے طور پر لکھتے ہیں کہ:

.......خطیب، مولانا سید سلیمان اشرف تھے اور اِس میں شک نہیں کہ بڑے فصیح و بلیغ مقرر تھے۔

موصوف کی تقریر نے، جو بڑی لمبی تھی، کانفرنس کو ہلا ڈالا۔

اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ اب اور کچھ کہنا ممکن نہیں۔'' (ذکرِ آزاد۔ و ہفت روزہ چٹان، لاہور۔ ۶/مارچ ۱۹۶۱ء)

تحریکِ خلافت (۱۹۱۹ء) تحریکِ تَرکِ موالات (۱۹۲۰ء) تحریکِ ہجرت (۱۹۲۰ء) کا دَور بڑا ہی سنگین اور بُحرانی دَور تھا۔ جس میں بعض عُلما و مسلم قائدین نے نہایت جذباتی ماحول پیدا کرنے کے ساتھ، شرعی بے اُصولی و بے اِعتدالی کا نہایت افسوسناک سلسلہ، شروع کر رکھا تھا۔

جس کے سَدِّ باب کے لئے فقیہِ اسلام، امام احمد رضا و دیگر اکابر عُلمائے اہلِ سنّت، کوشاں و سرگرداں تھے اور اپنی تحریرات و فتاویٰ کے ذریعہ، ہر مسئلہ میں صحیح اسلامی و شرعی موقف پیش کر کے مسلمانانِ متحدہ ہند کی ہدایت و رہنمائی فرما رہے تھے۔

ان عُلمائے کرام میں مولانا سید سلیمان اشرف کی ممتاز حیثیت ہے۔

آپ نے اپنی کتاب ''اَلرَّشاد ''اور''اَلنُّور ''کے ذریعہ
اس دَور میں اہلِ سنّت کا صحیح موقف،علمی واِستدلالی قوت کے ساتھ،پیش کیا۔
اِعتدال واِنحراف کی کشمکش کا ایک نمونہ،اجلاسِ بریلی،منعقدہ مارچ ۱۹۲۱ء تھا۔
جس میں آپ نے باوقار وباوزن اور مؤثر نمائندگی کا حق،ادا کر دیا۔
مولانا سید سلیمان اشرف کی خطابت اور شگفتہ بیانی،شہرۂ آفاق اور اپنی مثال آپ تھی۔
جسے خراجِ تحسین،پیش کرتے ہوئے خواجہ حسن نظامی،دہلوی (متوفی ۱۹۵۴ء) لکھتے ہیں:
''تقریر،ایسی تیز اور مسلسل کرتے ہیں،جیسے ای آئی آر کی ڈاک گاڑی۔
دَورانِ تقریر،صرف درود پڑھنے کے لئے تھوڑی دیر میں وقفہ ہوتا ہے۔
ورنہ معلوم ہوتا ہے کہ:
ہمالہ کی چوٹی سے گنگا کی دھار نکلی ہے،جو''ہَری دُوار'' تک
کہیں رکنے اور ٹھہرنے کا نام نہیں لے گی۔
بیان کی ایسی رَوانی،آج کل،ہندوستان کے کسی عالم میں نہیں ہے۔
تقریر میں محض الفاظ نہیں ہوتے۔ بلکہ ہر فقرے میں دلیل اور عِلمیّت کا
اندازہ ہوتا ہے۔'' (درویش جنتری ۱۹۲۳ء۔از خواجہ حسن نظامی،دہلوی۔مطبوعہ دہلی)
تحریکِ خلافت (۱۹۱۹ء) وتحریکِ عدم تعاون (۱۹۲۰ء) کے جذباتی وہیجانی دَور کا ایک اہم واقعہ
بیان کرتے ہوئے،نواب مشتاق احمد خاں،حیدرآبادی،فرزندِ نواب فخر یار جنگ،وزیر مالیات،حیدرآباد،دَکن
تحریر کرتے ہیں کہ:
''یہ تحریکِ عدم تعاون کا زمانہ تھا۔سب چھوٹے بڑے،نتائج سے بے پَروا،اسی رَو میں بَہے جارہے
تھے۔مولانا (سید سلیمان اشرف) اُن معدودے چند بزرگوں میں تھے،جنہیں،اِس تحریک سے اختلاف تھا۔
ان کی نظر میں بعض مُضمرات،مسلمانوں کے عقائد اور مفاد کے منافی تھے۔
مثلاً: شردھانند جیسے کٹّر ہندو کو تقریر کے لئے مسجد میں بلانا،ایک ناقابلِ برداشت جسارت تھی۔
مولانا (سید سلیمان اشرف) اپنے خیالات کا اظہار،کُھلَّم کُھلاَّ اور لگی لپٹی کے بغیر کر دیتے تھے۔

رَو میں بہہ جانے والے لوگوں نے، خاص کر بعض عُلماے کرام نے انہیں، بہت کچھ بُرا بھلا کہا
اوراخباروں اور رِسالوں میں، ان کے خلاف، لَعن طَعن ہوتی رہی۔ مگر وہ، ٹَس سے مَس نہیں ہوئے۔

ایک دن، جب وہ، تفسیرِ قرآن کا درس دے رہے تھے
مولانا محمد علی جوہر، جنھوں نے اس زمانہ میں اپنا مستقر، علی گڑھ بنا لیا تھا
طلبہ کے ایک گروہ کے ساتھ، مسجد (مسلم یونیوسٹی، علی گڑھ) میں تشریف لائے۔
اور قریب آکر مولانا پر ایک فقرہ، چست کر دیا۔.....
اس کے بعد میں نے جو کچھ دیکھا اور سنا
مولانا کی اعلیٰ شخصیت اور کردار کی بلندی کا واضح ثبوت مل گیا۔
وہ، نہ صرف، اپنے موقف پر ڈٹے رہے، بلکہ اس گرما گرم بحث میں
مولانا محمد علی جوہر جیسے شخص کو، نیچا دکھا دیا۔
اُس دن میں نے مولانا کو، بڑے جلال میں دیکھا۔
اُن کی، یہ بات، مَیں، کبھی نہیں بھول سکتا کہ:
''آپ لوگوں نے مذہبی اصول اور فقہی مسائل کو تماشا بنا دیا ہے۔
مَیں، زندہ رہا تو دیکھوں گا کہ کون، حق پر ہے؟''

(ص۹۲۔ ماہنامہ ''ضیاے حرم'' لاہور۔ شمارہ جون ۱۹۷۷ء)

یہاں، یہ تاریخی حقیقت بھی، واضح رہے کہ:
تحریکِ خلافت وتحریکِ تَرکِ موالات کو
شاعرِ مشرق، ڈاکٹر اقبالؔ (متوفی ۱۹۳۸ء) بھی
نتائج کے اعتبار سے مسلمانانِ ہند کے لئے بے حد نقصان دِہ اور خطرناک سمجھتے تھے۔

جسے ڈاکٹر اقبالؔ نے لکھا بھی ہے۔ اور آپ کے فرزند، ڈاکٹر جسٹس، جاوید اقبال (متولد، اکتوبر ۱۹۲۴ء۔ متوفی، ذوالحجہ ۱۴۳۶ھ/اکتوبر ۲۰۱۵ء) اپنی کتاب ''زندہ رَوَد'' میں صراحۃً، ذِکر کیا ہے۔
اس موضوع کی تفصیل وتحقیق کے لئے ملاحظہ فرمائیں:
''عُلماے اہلِ سنَّت کی بصیرت وقیادت۔'' بقلم: یٰسٓ اختر مصباحی۔

مطبوعہ مجلسِ فکرِ رضا۔ ۱۰۹۰۔ بستی جو دِھیوال، لودھیانہ، پنجاب۔ ۱۴۳۳ھ/۲۰۱۲ء۔
مذکورہ تحریکات کے پیدا کردہ اِضطرابی و ہیجانی ماحول اور اس کے نتائج و ثمرات، وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر رشید احمد صدیقی (علی گڑھ) اپنے مخصوص اسلوب میں لکھتے ہیں کہ:
''۱۹۲۱ء کا زمانہ ہے۔ ''**نان کو آپریشن**'' کا سیلاب اپنی پوری طاقت پر ہے۔
گائے کی قربانی اور موالات پر، بڑے بڑے جیّد اور مستند لوگوں نے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔
اُس زمانے کے اخبارات، تقاریر، تصانیف اور رُجحانات کا اب اندازہ کرتا ہوں
تو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیا سے کیا ہو گیا؟
اُس وقت، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ:
جو کچھ کہا جا رہا ہے، وہی سب کچھ ہے۔ یہی باتیں، ٹھیک ہیں۔
ان کے علاوہ، کوئی اور بات ٹھیک ہو ہی نہیں سکتی۔
کالج (علی گڑھ) میں عجیب افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔
مرحوم (سید سلیمان اشرف) مَطعون ہو رہے تھے۔
مگر، چہرے پر کوئی اثر تھا اور نہ معمولات میں کوئی فرق۔..........
کہتے تھے: رشید! دیکھو۔ عُلما، کس طرح لیڈروں کا کھلونا بنے ہوئے ہیں
اور لیڈروں نے مذہبی اصول اور فقہی مسائل کو کیسا گھروندا بنا رکھا ہے۔؟
(چند سطروں کے بعد)۔ سیلاب گذر گیا۔ جو کچھ ہونے والا تھا، وہ بھی ہوا۔
لیکن، مرحوم (سید سلیمان اشرف) نے اس عہدِ سراسیمگی میں
جو کچھ لکھ دیا تھا، بعد میں معلوم ہوا کہ:
حقیقت، وہی تھی۔ اس کا ایک ایک حرف، صحیح تھا۔
آج تک اس کی سچائی، اپنی جگہ، قائم ہے۔
سارے عُلما، سیلاب کی زَد میں آ گئے تھے۔ صرف مرحوم، اپنی جگہ، قائم تھے۔ الخ
(ص ۲۳ تا ص ۲۴۔ ''گنج ہائے گراں مایہ''۔ از پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵)
''مرحوم کے خلاف، اخباروں میں، بڑے نامعقول مضامین نکلے۔

اور اکثر ایسے نارَ وا اور رَکیک حملے کیے گئے کہ انہیں، یاد کر کے آج تک، میرا دل، کُڑھتا ہے۔
اور لکھنے والوں سے قلبی نفرت، پیدا ہو گئی ہے۔لیکن، مولانا پر کوئی اثر نہ تھا۔
آج تک میں نے، ان کی زبان سے کوئی کلمہ ایسا، نہ سنا جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہو کہ:
ان پر، اس کا کوئی اثر ہو۔

ایک دن، معلوم نہیں، کون سا موقع تھا کہ اس اخباری گندگی کا تذکرہ آیا
تو، فرمایا۔ اور اپنے مخصوص قلندرانہ انداز سے:
چلو! آگے بڑھو۔ یہ نہیں دیکھتے، کون کہہ رہا ہے؟
صاحب زادے ہو۔ یہی دیکھتے ہو کہ کس کے خلاف کہہ رہا ہے؟
لڑائی، مجھے پسند ہے۔لیکن، بہادروں سے۔ ہیِسَواؤں سے نہیں۔''

(ص ۲۶ تا ص ۴۴۔ ''گنج ہائے گراں مایہ''۔از پروفیسر رشید احمد صدیقی۔مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵)

تحریکِ خلافت (۱۹۱۹ء) و تحریکِ تَرکِ موالات (۱۹۲۰) اور اس سے پہلے پیدا شدہ
چند اہم مسائل کی اصولی تحقیق پر مبنی، آپ کی کتاب ''اَلــرَّشــاد'' اور ''اَلــنُّــور''، علی گڑھ ہی سے
باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شیر وانی، ۱۳۳۹ھ/۲۱-۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی تھی۔

اِسی طرح، عربی زبان و ادب کی بے نظیر خصوصیات پر مشتمل کتاب ''اَلْمُبین'' بھی علی گڑھ ہی سے
۱۹۲۹ء میں، باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شیر وانی، شائع ہوئی۔

''اَلْحج'' اور ''اَلْاَنْہَار'' بھی، آپ کی نہایت گراں قدر تحقیقی کتابیں ہیں۔

مسلم یونیوسٹی، علی گڑھ کے شعبۂ دینیات کا نصابِ تعلیم، مرتَّب کرنے میں مولانا سید سلیمان اشرف
کا بنیادی کردار ہے۔ جس کی تفصیل، مولانا سید سلیمان ندوی (متوفی ۱۹۵۳ء) نے ماہنامہ ''معارف''
اعظم گڑھ۔ یو پی کے ایک اداریہ میں اِس طرح، بیان کی ہے:

''مسلم یونیوسٹی کے بعض اَرکان کی کوشش ہے کہ:
یونیورسٹی میں، علومِ شرقیہ کا بھی شعبہ، قائم ہو۔ کیوں کہ مسلم یونیورسٹی کے لئے جب روپیہ، فراہم کیا
جا رہا تھا، تو مسلمانوں کو اس کی توقع دلائی گئی تھی۔ اس لئے اب اس وعدہ کے وفا کرنے کے دن آ گئے ہیں۔
چنانچہ، اِس غرض سے منتظمینِ یونیورسٹی کی دعوت پر
چند عُلما، جو جدید ضرورت سے آگاہ اور درس گاہوں کا تجربہ رکھتے تھے، علی گڑھ میں جمع ہوئے۔

اور متواتر، سات (۷) اجلاس، گیارہ فروری سے، سترہ (۱۷) فروری تک، منعقد ہوتے رہے۔
مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو سمجھا اور اس کے لئے یہ نقشۂ عمل
اور ایک نصاب، میٹرک سے ایم اے تک تیار کر کے یونیورسٹی کے سامنے، پیش کر دیا۔
اس مجلس کے اَرکان، حسبِ ذیل افراد تھے:
نواب، صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، مولانا سید سلیمان اشرف، صدر علومِ شرقیہ مسلم یونیوسٹی، مولانا مناظر احسن گیلانی، استاذِ دینیات، جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد، دَکن مولانا امجد علی، صدر مدرس مدرسہ معینیہ اجمیر اور یہ خاکسار۔
مولانا عبد العزیز صاحب میمن، راج کوٹی، استاذِ ادبیات، مسلم یونیوسٹی نے خاص موقعوں پر شرکت کی۔" (اداریہ، ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ۔ بقلم سید سلیمان ندوی۔ شمارہ فروری ۱۹۲۶ء)
مولانا سید سلیمان اشرف کا ایک اہم کارنامہ، یہ بھی ہے کہ:
سَر ضیاء الدین، وائس چانسلر، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، جو ایک مسئلۂ ریاضی کے حل کے لئے جرمنی کا سفر کرنے جارہے تھے، انہیں، نہ صرف، یہ کہ اس مسئلہ کے حل کے لئے امام احمد رضا قُدِّسَ سِرُّہٗ کی طرف، متوجہ کیا، بلکہ انہیں، ساتھ لے کر
بریلی شریف پہنچے اور اپنے مقصدِ سفر میں صد فی صد کامیاب ہوئے۔
مولانا ظفر الدین، قادری رضوی، عظیم آبادی، ایک روایت، مولانا محمد حسین بریلوی ثمَّ میرٹھی خلیفۂ امام احمد رضا کی، اِس طرح، بیان کرتے ہیں کہ:
سر ضیاء الدین، ریاضی کے ایک پیچیدہ مسئلہ کے حل کے لئے دورۂ جرمنی کی تیاری کر رہے تھے کہ:
"حُسنِ اتفاق سے جناب مولانا سید سلیمان اشرف بہاری، پروفیسر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے ذکر کیا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ:
آپ، بریلی جا کر، اعلیٰ حضرت، مولانا احمد رضا خاں صاحب سے دریافت کیجیے
وہ، ضرور حل کر دیں گے۔
......دو چار دن کے بعد مولانا سلیمان اشرف نے اُن کو پریشان دیکھ کر، پھر، یہی مشورہ دیا۔" الخ۔
(ص ۲۶۵۔ **حیاتِ اعلیٰ حضرت**، حصہ اول۔ مطبوعہ رضا اکیڈمی۔ بمبئی)
بعض بدخواہوں نے، سر ضیاء الدین کو امام احمد رضا کے تعلق سے بدگمان کرنا چاہا کہ:
وہ، بڑے سخت مزاج ہیں۔ تم جیسے داڑھی مُنڈے سے بات بھی نہیں کریں گے۔ وغیرہ وغیرہ

لیکن، سرضیاءالدین، پختہ مزاج شخص اور اپنے عزم میں کامل تھے۔

''انہوں نے ارادہ، نہ بدلا۔ اور جناب مولانا سید سلیمان اشرف بہاری سے (جو بڑے زبردست سنّی اور اعلیٰ حضرت کے ہم خیال و ہم عقیدہ عالم، اس زمانہ میں وہاں پر، پروفیسر دینیات تھے) مشورہ کیا۔ انہوں نے، بہت زبردست طریقہ سے، نہ صرف مشورہ دیا، بلکہ بہت زور دیا۔

.........یہ مشورہ دے کر، اِحتیاطاً، حضرت صاحب زادۂ اکبر، مولانا شاہ حامد رضا خاں صاحب حجۃ الاسلام کے نام، خط لکھ دیا کہ:

ڈاکٹر سرضیاءالدین صاحب، ایک مسئلۂ ریاضی کے حل کے سلسلے میں اعلیٰ حضرت کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ ان کی حسبِ شان، خاطر داری ہونی چاہیے۔'' الخ۔

(ص ۲۶۷۔ حیاتِ اعلیٰ حضرت، حصہ اول۔ مطبوعہ رضا اکیڈمی، بمبئی)

''سید ایوب علی، رضوی، بریلوی صاحب کا بیان ہے کہ:

ڈاکٹر (سرضیاءالدین) صاحب، مولانا سید سلیمان اشرف صاحب کو لے کر، مارہرہ شریف پہنچے۔ اور وہاں سے والا درجت، جناب سید شاہ مہدی حَسَن میاں صاحب، سجادہ نشین مارہرہ شریف پیرزادۂ اعلیٰ حضرت کو لے کر، بریلی شریف پہنچے۔'' الخ۔

(ص ۲۷۱۔ حیاتِ اعلیٰ حضرت، حصہ اول۔ مطبوعہ رضا اکیڈمی، بمبئی)

اِس طرح، وہ پیچیدہ مسئلۂ ریاضی، جس کے حل کے لئے سفرِ جرمنی کی تیاری
سرضیاءالدین، پورے طور سے کر چکے تھے، اسے بارگاہِ رضوی میں پیش کیا
اور چند ہی لمحات میں اس کا اطمینان بخش جواب پا کر نہایت مسرور ہو کر علی گڑھ واپس ہوئے۔

اپنے استاذِ جلیل، مولانا ہدایت اللہ، جون پوری (وصال ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء)
تلمیذِ رشید، علّامہ فضلِ حق خیرآبادی (وصال، صفر ۱۲۷۸ھ/۲۰/اگست ۱۸۶۱ء۔ در جزیرۂ انڈمان و نکوبار) کے ساتھ، مولانا سید سلیمان اشرف، بہاری، علی گڑھی، صدر شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کو غایت درجہ تعلقِ خاطر تھا۔

آپ کے حُسنِ عقیدت کا ذکر کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی (متوفی ۱۹۵۳ء) لکھتے ہیں کہ:

''مولانا سید سلیمان اشرف مرحوم کو حقیقت، یہ ہے کہ:
اپنے استاذ کے ساتھ، عقیدت ہی نہیں، بلکہ عشق تھا۔
ان کے حالات، جب وہ، بیان کرتے تو ان کے طرزِ بیان اور گفتار کی

ہر اَدا سے ان کی والہانہ عقیدت، ترا وش کرتی تھی۔ الخ۔

(ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ۔ بقلم سید سلیمان ندوی۔ شمارہ جون ۱۹۳۹ء)

اور اپنے مُرشدِ اجازت وخلافت، فقیہِ اسلام، امامِ اہلِ سنّت، مولانا احمد رضا، قادری برکاتی، بریلوی (وصال ۲۵؍صفر ۱۳۴۰ھ/۲۸؍اکتوبر ۱۹۲۱ء) کے ساتھ، مولانا سید سلیمان اشرف کی قلبی وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے آپ کے ایک شاگرد، ڈاکٹر سید عابد احمد علی، سابق لکچرر شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ لکھتے ہیں:

''استاذِ محترم، سید سلیمان اشرف پر، حضرت مولانا بریلوی کا اتنا اثر تھا کہ:

میں نے مولانا احمد رضا خاں قُدِّسَ سِرُّہٗ کی عظیم شخصیت کا اندازہ

دراَصل، استاذِ محترم کی شخصیت سے ہی لگایا۔ مجھے مولانا سید سلیمان اشرف سے شرفِ تلمُّذ کے علاوہ، اُن کا انتہائی قُرب بھی حاصل رہا اور میں، دیکھتا کہ:

اکثر، مولانا بریلوی کا ذِکر چھیڑ دیتے اور یوں محسوس ہوتا کہ:

اکثر، انہیں کے تصور میں مگن رہتے ہیں۔ حتّٰی کہ استاذِ محترم کی طبیعت بھی، ان کے ہی رنگ میں رنگ گئی تھی۔

اور اپنے معتقدات اور ایمانیات میں منطقی اِستدلال اور علومِ عقلیہ میں خوش کلامی اور قوتِ بیان میں، مولانا بریلوی کے انداز اور کیفیات کو اپنا چکے تھے۔

غیر اسلامی شعائر کی مذمّت میں تشدُّد، کانگریس اور ہندوؤں کی ہم نوائی کرنے والے لیڈروں اور عالموں کے متعلق، سخت گیر روَیّہ، مشرکین کو نجس سمجھنا اور ان کے معاملے میں

کسی قسم کی مداہنَت، رَوا، نہ رکھنا، یہ سب صفات، دونوں بزرگوں میں مشترک تھیں۔

اسی طرح، عشقِ رسول کے معاملے میں طبیعت کا ایک والہانہ انداز بھی

سید صاحب میں حضرت فاضلِ بریلوی کی طرف سے آیا تھا۔

لباس اور وضع قطع میں بھی، استاذِ محترم (سید سلیمان اشرف)

حضرت مولانا بریلوی کا ہی تتبُّع فرماتے۔ یہاں تک کہ مجھے، یاد ہے کہ:

آپ، عمامہ بھی اسی انداز کا رکھتے، جیسا کہ حضرت مولانا بریلوی مرحوم، استعمال فرماتے تھے۔''

(ص ۹ و ص ۱۰۔ مقالاتِ یومِ رضا۔ مطبوعہ لاہور۔ بقلم ڈاکٹر سید عابد احمد علی، ڈائریکٹر بیتُ القرآن، لاہور۔ وسابق لکچرر شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

یہی ڈاکٹر سید عابد احمد علی، شاگردِ مولانا سید سلیمان اشرف لکھتے ہیں کہ:

''غالباً ۱۹۳۳ء کا واقعہ ہے کہ:
علاّمہ اقبالؔ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں موجود تھے۔ ایک مجلس، جس میں مَیں بھی موجود تھا
دَورانِ گفتگو، مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا تذکرہ آ گیا۔
علاّمہ (اقبالؔ) مرحوم نے، مولانا بریلوی کو خراجِ تحسین و عقیدت، پیش کرتے ہوئے کہا:
''ہندوستان کے دَورِ آخر میں، ان جیسا طبّاع و ذہین فقیہہ، پیدا نہیں ہوا۔
............سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے علاّمہ اقبالؔ نے فرمایا کہ:
میں نے ان کے فتاویٰ کے مطالعہ سے، یہ رائے قائم کی ہے۔
اور ان کے فتاویٰ، ان کی ذہانت و فطانت، جودتِ طبع، کمالِ فقاہت، اور علومِ دینیہ میں
تبحرِ علمی کے شاہدِ عدل ہیں۔
نیز فرمایا: مولانا بریلوی، ایک دفعہ، جو رائے، قائم کر لیتے تھے، اُس پر مضبوطی سے قائم رہتے تھے۔
یقیناً، وہ، اپنی رائے کا اظہار، بہت غور و فکر کے بعد کرتے تھے۔
لِھٰذا، اپنے شرعی فیصلوں میں، انہیں، کبھی کسی تبدیلی، یا رجوع کی ضرورت نہیں پڑی۔'' الخ۔
عابد احمد علی۔ یکم اگست ۱۹۶۸ء۔
(ڈاکٹر سید عابد احمد علی کے قلم سے اِس پورے تحریری بیان کا عکس، ہفت روزہ ''اُفق'' کراچی۔
شمارہ ۲۳ / تا ۲۸ / جنوری ۱۹۷۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔)
اردو زبان و ادب کے معروف ادیب و محقق، ڈاکٹر ابو اللّیث صدیقی (۱۹۱۶ء۔۱۹۹۵ء)
سابق صدر شعبۂ اردو، کراچی یونیورسٹی، کراچی، اپنی کتاب ''رفت و بود'' میں
مولانا سید سلیمان اشرف کے بارے میں، اپنے تأثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
''میں نے بہت سی یونیورسٹیاں دیکھی ہیں۔ بڑے بڑے عُلما کو دیکھا ہے۔
لیکن، مولانا سید سلیمان اشرف جیسا عالِم، میں نے نہیں دیکھا ہے۔''
(روزنامہ ''جسارت'' کراچی۔ شمارہ ۲۰ / جون ۱۹۸۰ء)
مولانا ڈاکٹر وزیر خاں، بہاری، اکبر آبادی اور مولانا سید سلیمان اشرف بہاری، علی گڑھی
اِن دونوں حضرات نے اپنے عہد و عصر میں ملکی سطح پر اپنی خدمات کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔
اپنی طویلُ المیعاد منصوبہ بندی اور حربی و عسکری تگ و تاز کے لئے

مولاناوزیرخاں نے دہلی،آگرہ،بدایوں،لکھنؤ،محمدی(شاہجہاں پور)وغیرہ کواپنامرکز بنایا اورتحریکِ خلافت (۱۹۱۹ء)وتحریکِ تَرکِ مولات (۱۹۲۰ء) کے ہنگامہ خیز دَور میں مولاناسیدسلیمان اشرف نےعلی گڑھ میں بیٹھ کر،اپنےقلم کےذریعہ مسلمانانِ ہند کی فکری رہنمائی فرمائی۔

سرزمینِ بہار کی،یہ دوعظیم شخصیتیں ایسی ہیں کہ:

عُلما ومحققین ومؤرخین کواپنے مطالعہ وتحقیق کے ذریعہ ان کی خدمات کو زیادہ سےزیادہ اُجاگرکرناچاہیے۔

اورصرف انھیں کی خدمات کونہیں،بلکہ اس طرح کی دیگرعظیم شخصیات پربھی تحقیق کر کے ان کے کارناموں کونئی نسل کے سامنے،پیش کرناچاہیے۔تاکہ اپنے اسلاف واکابر سےنئی نسل نہ صرف واقف ہو،بلکہ اس کےاندر،بیداری وعزم وحوصلہ پیداہو اوران کےنقشِ قدم پر چلتے ہوئے نئے دَور کے تقاضوں کے مطابق ،خدمتِ دین وملّت اورقوم وملک میں وہ،سرگرم حصہ لےکراپنانمایاں کردارادا کر سکے۔

وَاللہُ الْمُوفِّق وَ هُوَ الْمُسْتعان وَعَلَیْهِ التُّکْلان۔

☆☆☆

یٰسٓ اختر مصباحی
دارالقلم،ذاکرنگر،نئی دہلی۔۲۵
موبائل:۔09350902937
misbahi786.mk@gmail.com

مورخہ
۲۸؍رجب ۱۴۳۸ھ
۲۶؍اپریل ۲۰۱۷ء
بروز چہارشنبہ